ھٰذا بلاغ للناس
ماہنامہ
البلاغ
کراچی
زیر سرپرستی
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

دولت کی تقسیم

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقدہ فروری ۶۸ میں حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ نے جو مقالہ پڑھا تھا وہ ماہنامہ البلاغ کی اس اشاعت میں شائع کیا جارہا ہے

مقالہ میں عصر حاضر کے ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلے (تقسیم دولت) پر جسنے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے سیر حاصل بحث کرکے بتایا گیا ہے کہ اسلام نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے! ضرورت ہے کہ حضرت ممدوح کے ان خیالات کو پڑھے لکھے حلقہ میں زیادہ سے زیادہ پہنچایا جائے۔ مقالہ عنقریب کتابی شکل میں بھی شائع کیا جارہا ہے.

(ادارہ)

محرم سنہ ۱۳۸۸ھ
اپریل سنہ ۱۹۶۸ء

جلد ۲
شمارہ ۱

فی پرچہ: ۵۶ پیسے • سالانہ: ۶ روپے • غیر ممالک سے: ایک پونڈ سالانہ • ہوائی ڈاک سے: ۲ پونڈ سالانہ
ڈاک کا پتہ: ماہنامہ "البلاغ" دارالعلوم کراچی۔ فون: ۳۸۱۱۷

ہندوستانی خریدار مندرجہ ذیل پتہ پر چندہ ارسال فرما کر ڈاکخانے کی رسید بھیج دیں، رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے گا:
مولانا ظہور الحسن صاحب۔ خانقاہ امدادیہ۔ تھانہ بھون۔ ضلع مظفر نگر (یوپی)

مدیر اعلیٰ
محمد تقی عثمانی

مدیر انتظامی
خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری

جلد ۲
شمارہ ۱

محرم سنہ ۱۳۸۸ھ
اپریل سنہ ۱۹۶۸ء

فی پرچہ: ۵۶ پیسے • سالانہ: ۶ روپے • غیر ممالک سے: ایک پونڈ سالانہ • ہوائی ڈاک سے: ۲ پونڈ سالانہ
ڈاک کا پتہ: ماہنامہ "البلاغ"۔ دار العلوم۔ کراچی۔ فون: ۳۸۱۱۷

ہندوستانی خریدار سند رجہ ذیل پتہ پر چندہ ارسال فرما کر رسید حاصل کر لیں، رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے گا:
مولانا ظہور الحسن صاحب۔ خانقاہ امدادیہ۔ تھانہ بھون۔ ضلع مظفر نگر (یو۔پی)

ت ر ت ی ب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چمن بچاؤ، غمِ آشیاں کا وقت نہیں

حمد و ستائش اس ذات کے لئے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا،

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبرؐ پر جنھوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا،

ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ، "ایک زمانے میں تمہارے گھروں میں فتنے اس طرح نازل ہوں گے جس طرح بارش کے قطرے گرتے ہیں" آج ہماری نگاہیں اس نبوی پیشینگوئی کو حرف بحرف پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہیں، تقریباً دو صدیوں سے پوری امتِ مسلمہ اپنی قسمت کے ایسے پھیر میں آئی ہوئی ہے کہ ہر صبح اس کے لئے نیا فتنہ جگا کر نمودار ہوتی ہے۔ اور ہر شام اپنے ساتھ غم و الم کی ایک نئی تاریکی لے کر آتی ہے۔ سیاسی طور پر کفر کی تمام طاقتیں اُسے ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لینے کی فکر میں ہیں، معاشی طور پر یہ امت دنیا کے بہترین قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود غیروں کی دست نگر بنی ہوئی ہے، اخلاقی طور پر اس نے وہ تمام اعلیٰ اوصاف گم کر دیئے ہیں جنھوں نے کبھی اس کو اقوامِ عالم کی امامت عطا کی تھی، علمی طور پر اس کے دشمنوں کی طرف سے اس پر تابڑ توڑ حملے ہو رہے ہیں۔ اور ذہنی طور پر یہ خود ان حملوں سے سہم کر فکر و نظر کے دوسرے راستے تلاش کرنے کی فکر میں ہے، غرض جس پہلو سے دیکھئے، فتنوں کی ایک بارش ہے جو اس پر برس رہی ہے، اور ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح اس کو کوئی مستقل پناہ گاہ میسر نہیں۔

لیکن ان تمام تلخ حقیقتوں کے باوجود مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز آیا ہی کرتے ہیں، اگر اپنی خطا کاریوں پر احتساب کرنے کا حوصلہ اور ان سے سبق حاصل کرنے کا عزم ہمارے دلوں میں بیدار ہو تو ہم آج بھی ان تمام مصائب کا کامیاب مداوا کر سکتے ہیں، صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ساری امت متحد اور منظم ہو کر پوری بیدار مغزی کے ساتھ ان تمام فتنوں کا مقابلہ کرے جو ہمارے راست دین کے اصولوں پر حملہ آور ہیں ——— لیکن انتہائی کرب انگیز ہے یہ واقعہ کہ اس پُر آشوب دور میں بھی جبکہ ہمارے دشمنوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے، ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ طرح طرح کی خانہ جنگیوں میں مصروف ہیں، جادۂ

کے لئے آپس کی لڑائیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، خود علمی اور دینی سطح پر ہماری بہت سی قیمتی توانائیاں اصل دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان فروعی مسائل پر جھگڑنے میں صرف ہو رہی ہیں جو نہ کبھی طے ہوئے ہیں، نہ ہو سکتے ہیں، ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کا گریبان تھامنے، اس پر کیچڑ اچھالنے اور اسے طعن و تشنیع کا ہدف بنانے میں اس قدر محو ہو چکے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کے اصل مسائل ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، اور اصولِ دین کا میدان ہم نے دشمن کی یلغار کے لئے خالی چھوڑ رکھا ہے۔

اتفاق و اتحاد کی ضرورت و اہمیت وہ چیز ہے جس کے بارے میں آج تک کسی کو کوئی کلام نہیں ہوا، شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو ان باہمی جھگڑوں کو مضر اور خطرناک نہ سمجھتا ہو، لیکن اس کے باوجود انتشار و افتراق کی جو المناک صورت ہمارے سامنے ہے اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اتحاد و اتفاق کے مفہوم کو صحیح طور سے سمجھا نہیں گیا، ہم میں سے بعض حضرات تو وہ ہیں جو اتحاد اور اتفاق کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ تمام مسلمان ہر ہر جزوی مسئلے میں ان کے نظریات کو تسلیم کر لیں۔ لہٰذا جب تک کوئی شخص ان نظریات کو نہ اپنائے جنہیں وہ درست سمجھتے ہیں اس وقت تک وہ اس کے ساتھ کسی اشتراکِ عمل اور کسی قسم کے تعاون کو گوارا نہیں کرتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تمام تر توانائیاں اپنے مخصوص فروعی مسلک کی تبلیغ و اشاعت میں صرف ہوتی ہیں، اور وہ اس مسلک کی تبلیغ کے لئے بسا اوقات ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں جو دوسروں کو قریب لانے کے بجائے افتراق و انتشار کی فضا کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔

دوسری طرف بعض حضرات وہ ہیں جو اتحاد و اتفاق کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ تمام لوگ اپنے اپنے مسلک پر رہیں، لیکن کوئی شخص اپنے مسلک کو بیان نہ کرے۔ لہٰذا جب کوئی شخص کہیں پر اپنی رائے بیان کرتا ہے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے اتحادِ امت پر ضرب لگی ہے۔ اور پھر وہ بھی اس شخص کے خلاف مہم چلانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔

ہماری ناقص رائے میں یہ دونوں طرزِ عمل غلط ہیں اور ان سے اتحاد و اتفاق کی فضا کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک فروعات میں اختلافِ رائے کا تعلق ہے اس کا ختم ہو جانا نہ معقول ہے اور نہ ممکن، فروعی مسائل میں اختلاف کوئی بری چیز نہیں، صحابۂ کرامؓ کی مقدس جماعت میں بھی یہ اختلافات رہے ہیں، اور ہماری چودہ سو سالہ تاریخ کا کوئی لمحہ ان سے خالی نہیں رہا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رائے کا یہ اختلاف ملت کی فکری بیداری پر دلالت کرتا ہے اور جب تک مسلمانوں میں عقل و دیانت موجود ہے اس وقت تک اختلافات کا مٹنا ممکن نہیں۔

لیکن تشویشناک بات یہ ہے کہ جس اختلاف کو اس "چمن کی زیبائش" کا سبب بننا چاہئے تھا آج وہ اس کی بربادی کا سبب بن رہا ہے جس اختلاف کو امت کے لئے "رحمت" قرار دیا گیا تھا، آج ہم نے اسے اپنے لئے "زحمت" بنا لیا ہے، اختلافِ رائے کو "جھگڑے" کا ہم معنی سمجھ کر ہم آپس کی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ سے دین کے بنیادی مقاصد بری طرح مجروح ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس تکلیف دہ صورتِ حال سے بچنے اور مسلمانوں کو متحد کر کے دین کے بنیادی مقاصد پر متوجہ کرنے کا راستہ ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ:

(۱) مسلمانوں کے وہ تمام فرقے اور جماعتیں جن کے درمیان دین کے بنیادی اور جوہری امور میں اختلاف نہیں ہے۔ زبانی اور قلمی مناظروں سے مکمل پرہیز کریں۔

(۲) ہر فرقہ اپنے تدریس، تصنیف اور فتویٰ کے حلقوں میں اپنے مسلک کو ضرور واضح کرے لیکن اس میں دوسرے پر طعن و تشنیع، فقرہ بازی اور ملامت و تعریض کے دلآزار اسلوب کو قطعی طور پر ترک کیا جائے۔

(۳) ان اختلافات کو عوامی جلسوں، اور اخبارات و رسائل کا بنیادی موضوع نہ بنایا جائے

کسی جگہ ضمناً ان کا ذکر ضروری معلوم ہو تو اس میں نرم لب ولہجہ کے ساتھ مسلک کی وضاحت کر دی جائے۔

(۴) تمام مسلمان اپنی توانائیاں بے دینی کے اس سیلاب پر بند باندھنے میں صرف کریں جس نے ہمارے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

(۵) ہر جماعت کے اہل علم وقت کے ان علمی فتنوں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں جو اشتراکیت، عیسائیت، دہریت، قادیانیت، انکار حدیث اور تجدد و تحریف دین کی شکل میں براہ راست دین کی بنیادوں پر حملہ آور ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارے اہل علم وفکر حضرات ان نظریات کا کما حقہٗ مطالعہ کر کے ان کی فتنہ سامانیوں سے پوری طرح آگاہ ہوں گے تو انہیں آپس کے یہ اختلافات ہیچ نظر آئیں گے۔ اور فروعی مسائل پر بحث ومباحثہ کی یہ گرم بازاری انہیں گناہ محسوس ہوگی۔

ہماری نظر میں یہ وہ طریق کار ہے جسے ہر فرقہ کے ذمہ دار اکابر اپنالیں تو ہماری بہت سی مشکلات کا مداوا ہو سکتا ہے۔ "البلاغ" کے سرپرست حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی عرصۂ دراز سے تمام مسلمانوں کو اس طرز عمل کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت کی وہ پکار ہے جس پر آج بھی لبیک نہ کہا گیا تو ہمارا انجام بڑا ہولناک ہوگا۔ ہماری تاریخ کے صفحات اس قسم کے واقعات سے لبریز ہیں کہ مسلمانوں میں جب بھی فروعی مسائل پر معرکے گرم ہوئے ہیں، ہمیشہ کسی "فتنۂ تاتار" نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے، اور اس کے نتیجہ میں بعض اوقات قومیں کی قومیں حسرتوں کی درد بھری داستان بن کر رہ گئی ہیں، ایسی داستان جو سن کر آج آنسو بہانے اور آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا!

الحمد للہ کہ "البلاغ" کا ایک سال خیر وخوبی کے ساتھ پورا ہو گیا، اور اس شمارے سے وہ اپنی دوسری جلد کا آغاز کر رہا ہے، جن حضرات نے باقاعدگی کے ساتھ اس کو پڑھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہمارا طرز عمل شروع سے یہ رہا ہے کہ ہم نے اپنی تمام تر توجہ مثبت انداز میں دین کی تعلیمات کو پیش کرنے اور ان بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنے میں صرف کی ہو جو اس وقت امتِ مسلمہ کو درپیش ہیں، فروعی اختلافی مسائل کو اول تو چھیڑا ہی نہیں گیا، اور اگر کہیں ضمنی طور پر ان کا تذکرہ آیا بھی ہے تو اس میں ایجابی طور سے اپنے مسلک کی وضاحت کی گئی ہے، اور تنقید کا لب ولہجہ ہمیشہ نرم اور ہمدردانہ رہا ہے۔ اس دوران کئی مواقع ایسے بھی آئے کہ بعض حضرات نے کچھ فروعی مسائل کی طرف البلاغ کو متوجہ کیا، جماعت اہل حدیث کے بعض متشدد حضرات نے اسی دوران ایک خاصا ضخیم کتابچہ بھی تقسیم کرایا جس میں خاکسار مدیر "البلاغ" کو کافر و مشرک تک کہا گیا تھا۔ ہمارے بعض محترم قارئین نے خطوط کے ذریعہ ہم سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ "البلاغ" اس پر کچھ لکھے، خود اہل حدیث میں سے بعض دردمند اصحاب نے ہمیں خطوط لکھ کر اس تشدد سے اپنی براءت کا اظہار فرمایا اور ایسے مضامین ہمارے پاس بھیجے جن میں غرباء اہل حدیث کو جماعت اہل حدیث سے خارج قرار دیا گیا تھا، لیکن ہم نے ان میں سے کسی چیز کو البلاغ میں شائع کرنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ اس سے بحث کا دروازہ کھلتا تھا، اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ البلاغ کی توانائیاں ان نزاعات میں صرف ہوں۔

لیکن جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، فروعی مسائل کو اپنا اصل موضوع بحث بنائے بغیر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے مسلک کی توضیح وتشریح کرنا ہمارے نزدیک اتحاد واشتراک کے منافی نہیں ہے، اسی وجہ سے ماہ شوال کے البلاغ میں تقلید کے مسئلے پر حضرت الشیخ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی دامت برکاتہم کا ایک مختصر مضمون ہم نے ضرور شائع کیا تھا، اس مضمون کا پورا انداز و اسلوب اس

بات کا گواہ ہے کہ اس کا مقصد کوئی بحث و مناظرہ نہ تھا، بلکہ اس میں فاضل مضمون نگار نے اپنے مسلک کی توضیح کیلئے بڑے متین انداز میں اپنا ایک واقعہ بیان کیا تھا، ہمیں سخت افسوس ہے کہ ہمارے بعض معاصرین نے اس مضمون کا ضرورت سے بہت زیادہ اثر لیا، اس تین صفحے کے مختصر مضمون کی بنیاد پر پے در پے کئی شماروں میں مستقل اداریے لکھے، پھر کئی دینی رسائل و اخبارات اس بحث میں الجھ گئے، اور اس طرح ایک تکلیف دہ مناظرہ کا آغاز ہو گیا، جس میں بات علمی گفتگو سے بڑھ کر ذاتیات تک جا پہنچی اور طعن و تشنیع سے لے کر ملامت و تعریض تک وہ سب کچھ ہوا جو ہرگز نہ ہونا چاہیے تھا۔

ان سطور کو لکھنے سے قبل ہم نے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مدظلہم العالی کے مضمون کو دوبارہ پڑھا، جن حضرات کے پاس البلاغ کا فائل موجود ہے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا لب و لہجہ تمامتر ناصحانہ اور مشفقانہ ہے اور اس میں کوئی بات موجب اشتعال نہیں، صرف ایک زائد جملہ اس میں ضرور آ گیا ہے کہ: "اہل حدیث قرآن پر عمل نہیں کرتے" لیکن اس کو پورے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ فاضل مضمون نگار کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ اہل حدیث قرآن کریم کے منکر یا سرے سے اس کے تارک ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حنفیہ کا مسلک اوفق بالقرآن ہے۔ اور اہل حدیث کا مسلک فاضل مضمون نگار کی رائے میں ایسا نہیں ہے ——— ہم نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی ایسی بات ہے جس کی بنا پر کوئی ہنگامہ کھڑا ہو اور اس کی وجہ سے بحث و مناظرہ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جائے۔

ابھی اس قلمی بحث و مناظرہ سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ اسی دوران اہل حدیث اور دیوبندی دونوں حضرات کی طرف سے زبانی مناظروں کے کچھ اشتہار بھی شائع کئے گئے جنہیں پڑھ کر قلبی اذیت انتہا کو پہنچ گئی۔

ہم اکابر اہل حدیث و دیوبند کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر ان کی خدمت میں انتہائی عاجزی کیساتھ یہ التجا کرتے ہیں کہ یہ فروعی اختلافات کبھی مٹنے والے نہیں ہیں، چودہ سو سال کی لوٹیں بحثیں ان کو نہیں مٹا سکیں، اور اگر یہ اپنی حدود میں رہیں تو ان کا باقی رہنا چنداں مضر بھی نہیں، اس لئے ان کے پیچھے بحث و مناظرہ اور باہمی نزاع و جدال کی اس تشویشناک صورت کو اب ہر قیمت پر ختم فرما دیجئے، یہ ملت عرصہ سے اپنے سینے میں سینکڑوں گھاؤ لئے بیٹھی ہے، خدا کے لئے باہمی نزاعات کے ذریعے اس کی مشکلات میں اضافہ نہ کیجئے۔ اگر اس نزاع و جدال کا سبب "البلاغ" ہے، اور ملت کے اصحاب فکر سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس معاملے میں "البلاغ" سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو مدیر البلاغ اس کے لئے ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہے، لیکن خدا کے لئے اس غلطی کی سزا اس پوری امت کو نہ دیجئے جو پہلے ہی اپنے زخموں سے نڈھال اور نیم جاں ہے، اور اس میں اب مزید صدمے اٹھانے کی تاب نہیں رہی، نیز فریقین کے وہ حضرات جنہوں نے ایک دوسرے کو دعوت مناظرہ دی ہے، ہم ان کی خدمت میں دست بستہ یہ گذارش کرتے ہیں کہ آپ کو اس خدا، اس رسول ﷺ، اس قرآن اور اس سنت کا واسطہ جسے آپ دونوں حضرات جزو ایمان سمجھتے ہیں، خدا کے لئے اپنے محدود و مخصوص دائروں سے باہر جھانک کر دیکھئے، کہ کفر و الحاد و بے دینی کا سیلاب کس تیزی کے ساتھ آپ کے گھروں کا رخ کر رہا ہے، دین کی جڑوں پر تشکیک و تحریف کا کلہاڑا کس بری طرح چل رہا ہے، دہریت اور مادہ پرستی کے ہرکارے کس عیاری کے ساتھ ہماری نوخیز نسل کو اغوا کر رہے ہیں، اور فحاشی و عریانی کے مبلغ کس ڈھٹائی کے ساتھ ہماری ماؤں بہنوں کی عصمت پر حملہ آور ہیں، اس وقت اصل مسئلہ اہل حدیث اور دیوبندی کا نہیں، اس وقت ملت کو جو معرکہ درپیش ہے وہ اسلام اور کفر کا ہے، حق اور باطل کا ہے، نور اور ظلمت کا ہے، اور اگر اب بھی ہمارے یہ باہمی جھگڑے ختم نہ ہوئے تو یقین کیجئے کہ نہ اہل حدیث باقی رہیں گے نہ دیوبندی، ہماری ان خانہ جنگیوں کا براہ راست فائدہ طاغوت کی ان طاقتوں کو پہنچیگا جو ہماری ان لڑائیوں پر اپنی فتح کے شادیانے بجا رہی ہیں، اس وقت ہمارا پورا چمن ہی مصائب و آلام کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔ اور اگر اب بھی ہم نے اس بات پر لڑائیاں جاری رکھیں کہ کس کا

آشیانہ زیادہ خوبصورت ہے، تو یاد رکھئے کہ یہ مصائب و آلام کا سیلاب ہم سب کے آشیانوں کو بہا کر لیجائے گا، اس وقت زمانے کی اہم ترین پکار یہ ہے کہ ؏

چمن بچاؤ، غمِ آشیاں کا وقت نہیں

کیا ملّت کے اکابر اس نحیف و نزار اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز پر کوئی توجہ فرمائیں گے؟ ــــ؟

گذشتہ مہینے راولپنڈی میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی معیت میں راقم الحروف کو بھی اس میں شرکت کا اتفاق ہوا، اس کانفرنس سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ اس کی بدولت عالم اسلام کے چیدہ اہل فکر کو ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے اور مسلمانوں کے بہت سے مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کا موقعہ ملا، کانفرنس میں بیشتر مندوبین نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کو سنکر یہ اطمینان ہوا کہ بحمداللہ دین کے بنیادی مسائل میں عالم اسلام کے ہر طبقے کی اکثریت صحیح اور متوازن فکر رکھتی ہے، اور قرآن و سنت اور اجماع امت کی ٹھیک ٹھیک پیروی کو دنیا اور آخرت میں اپنی صلاح و فلاح کا ضامن سمجھتی ہے، اور دین کے ان بنیادی سرچشموں کی تحریف و ترمیم کو کسی قیمت پر گوارا کرنے کیلئے تیار نہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ کانفرنس کی پوری کارروائی ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکی، اور صرف وہی باتیں اخبارات میں شائع ہوئیں جن سے ایک خاص طبقے کے جذبۂ جانبداری کی تسکین ہوتی تھی، اس شمارے میں ہم کانفرنس کی مختصر روئداد شائع کر رہے ہیں جس سے کانفرنس کے رنگ کا اندازہ کیا جا سکے گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے کانفرنس میں جو پُرمغز مقالہ پڑھا وہ بھی شریکِ اشاعت ہے، ہم اہل فکر حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کا بطورِ خاص مطالعہ فرمائیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے ہمارے معاشرے کی بہت سی مشکلات کا حل نکل آئے۔

---

۲۰ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ کی شام کو جماعت اہلِ حدیث کے امیر حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سلفی رحمۃ اللہ علیہ (گوجرانوالہ) رحلت فرماگئے، مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جن کی وفات کسی خاص خاندان، طبقے یا فرقے کے لئے نہیں، پوری ملّت کے لئے نقصان عظیم ہوتی ہے حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امیر جماعتِ اہلِ حدیث کی حیثیت سے آپ نے گرانقدر خدمات انجام دیں، اور اپنی ساری عمر خدمتِ دین کے مبارک کام میں صرف فرمائی وہ فروعی مسائل پر نزاع و جدال کے سخت مخالف اور وحدتِ امت کے داعی تھے، خدا کرے کہ ان کے اخلاف ان کے اس طرزِ عمل کو باقی رکھ سکیں، اور مسلمانوں کے درمیان اخوت و ہمدردی پیدا کرنے کے جس مقصد کو انھوں نے شروع کیا تھا، اسے وہ پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ ادارۂ البلاغ اس غم میں جماعتِ اہلِ حدیث کے ساتھ برابر کا شریک ہے، اور مرحوم کیلئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔

محمد تقی عثمانی
۲۳ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

آئندہ شمارے میں

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ایک تازہ غیر مطبوعہ مقالہ

کسریٰ کے نام آنحضرتؐ کا مکتوب گرامی

ملاحظہ فرمائیے جو پیرس سے ابھی موصول ہوا ہے

معارف القرآن

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

قرآن اور علم فلکیات

جس قدر انسان کے معاشی یا دینی مسائل ان سے متعلق ہیں
مثلاً سب سے بڑا مسئلہ تو انسان کے علم و یقین اور عقیدہ کا مسئلہ
ہے۔ آسمان اور آسمانی فضا کی تمام کائنات نجوم اور سیارے اور
ان کی حرکات سے پیدا ہونے والے لیل و نہار اور ماہ و سال اور پھر
زمین اور اس میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقات میں سے جس جس
چیز پر بھی نظر ڈالو اس کا وجود ایک ایسی ہستی کے وجود کی گواہی
دیتا نظر آتا ہے جو اپنے علم، حکمت، قدرت میں سارے جہان
سے بالا و بلند ہے۔ اور یہ کہ یہ تمام کائنات اسی کی قدرت کاملہ سے
پیدا ہوئی اور وہ ہی ان کو چلا رہا ہے جو یہی اسلام کا بنیادی عقیدہ
توحید ہے قرآن حکیم ان تمام کائنات میں اس حیثیت سے غور و
فکر کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ ارشاد ہے۔ ان فی خلق السموات
والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب
الذین یذکرون اللہ الآیۃ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وفی الآفاق وفی انفسکم افلا
تبصرون۔

یعنی اطراف عالم میں پھیلی ہوئی مخلوقات میں
اور خود تمہارے اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کی قدرت
کاملہ کی نشانیاں موجود ہیں۔

دوسرا مسئلہ انسان کے معاشی فوائد اور مصالح کا ہے۔ شمس و قم
اور ستاروں کی حرکات سے اوقات اور ماہ و سال اور حسابات
کا معلوم کرنا۔ سفر میں سمتوں اور راستوں کا علم۔ ابر و باران سے
متعلقہ فوائد کی معلومات۔ دواؤں اور غذاؤں کی اور نباتات
و جمادات کی تاثیرات اور خاصیات کا علم۔ مقناطیس کی یہ خاصیت
کہ وہ لوہے کو کھینچتا ہے اور قطب شمالی کے ساتھ اس کا کوئی
مخفی رابطہ ہے کہ اس کو جس طرف چھوڑو اس کا رخ قطب شمالی
کی طرف پھر جاتا ہے اس کا علم جس پر آجکل بحری اور فضائی
جہاز رانی کا سارا مدار ہے۔ کائنات عالم میں اس حیثیت سے غو
فکر بھی انسان کے لئے مفید ہے اور ایک مفید کام اللہ تعالیٰ کی
نعمتوں کی قدر شناسی کی حیثیت سے نیز خدمت خلق کی نیت
ایک کار ثواب ہے۔

قرآن کریم اس حیثیت سے کائنات عالم میں غور و فکر کی د
دیتا ہے۔ مثلاً حرکات نجوم سے اوقات لیل و نہار صبح و شام ا
حسابات ماہ و سال معلوم کرنے کے بارہ میں ارشاد ہے۔

لتعلموا عدد السنین والحساب

تاکہ جان لو تم تعداد برسوں کی اور حساب

اور سمتوں، راستوں کی پہچان کے بارہ میں ارشاد ہے۔

لتھتدوا بھا فی ظلمات البر والبحر

تاکہ تم راہ پاؤ ان ستاروں سے بری اور بحری اندھیریوں میں

اور زمینی مخلوقات سے انسانی فوائد معلوم کرنے کا اشارہ اس آیت میں موجود ہے۔

وخلق لکم ما فی الارض جمیعا۔

پیدا کیا تمہارے کام کے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔

غرض اس دوسری حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات و کائنات میں غور و فکر کرنا بھی مفید ثمرات و فوائد کا حامل ہے۔ اور یہ غور و فکر بھی منشا قرآنی میں داخل ہے اگرچہ ثانوی درجے میں ہو۔ کیونکہ پہلی حیثیت کا غور و فکر ایمان و معرفت کا نتیجہ پیدا کرتا ہے جس پر ایمان کی دائمی راحت موقوف ہے۔ اور دوسری حیثیت کا غور و فکر انسان کے معاشی مسائل حل کرتا ہے جس سے اس کی دنیوی زندگی کی سہولت و راحت متعلق ہے۔ بہرحال قرآن کریم کائنات عالم میں خواہ وہ فلکیات سے متعلق ہوں یا ارضیات سے ان دونوں حیثیتوں سے غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے، اور خاص چیزوں کی طرف اشارات بھی۔ مگر یہاں ایک تیسری حیثیت بھی اس تمام کائنات میں غور و فکر کی ہے وہ ان کے حقائق اور علل معلوم کرنے کا معاملہ ہے، اس حیثیت کے متعلق جہاں تک قرآن و سنت میں غور کیا جاتا ہے وہ انسان کو اس فکر میں مبتلا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں لوگوں کا یہ سوال ذکر کیا گیا ہے کہ

یسئلونک عن الاھلۃ۔ یعنی یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے اور طلوع و غروب کی علت کیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن حکیم نے عین حکمت و رحمت کے تقاضے سے علت بتلانے کی بجائے وہ حکمت بتلادی جس سے انسان کے فوائد متعلق ہیں یعنی فرمایا قل ھی مواقیت للناس یعنی آپ فرما دیں کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے لوگوں کے لئے اوقات ماہ و سال معلوم کرنے کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کی زندگیاں اس پر شاہد ہیں کہ انہوں نے ان بحثوں اور فکروں میں الجھنا پسند نہیں کیا۔ ورنہ فیثا غورس اور بطلیموس کے نظریات آپ کی بعثت سے ایک ہزار سال پہلے سے دنیا میں رائج تھے اور فلسفہ یونان کے طبعیات بھی معروف و مشہور تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ خود ان کی طرف کوئی التفات فرمایا نہ امت کو اس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔

مجھے اس جگہ اس طویل بحث سے یہی بتلانا منظور ہے کہ فلسفہ قدیم اور سائنس جدید کی نظر فریب شعبدہ بازیوں کو دیکھ کر حیرت میں رہ جانے والا انسان یہ معلوم کر سکے کہ قرآن و سنت نے اس تیسری حیثیت سے کائنات کے حقائق و علل میں غور و فکر سے گریز کیوں کیا۔

سابقہ بیانات جن میں سائنس جدید کی اعلیٰ ترقیات اور خلاء اور سیارات تک پہونچنے کے منصوبے شامل ہیں ان سب کے نتیجہ میں خلاء کے مسافروں اور سیارات پر کمند پھینکنے والوں کی کمائی کی جو حاصلات ہیں وہ آپ نے امریکی خلانورد "جان گلین" کے بیان میں پڑھ لیں۔ کہ اس تمام تگ و دو کے نتیجہ میں حقیقت تو کسی چیز کی حاصل نہ ہوئی، اور بے حد و بے حساب سیارات و نجوم کی حرکتوں کا ادراک ہو کر اور حیرانی بڑھ گئی۔ زمین پر بیٹھنے والے جس طرح آسمانی فضاء کی چیزوں سے بہت دور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں اس خلانورد نے زمین سے لاکھوں میل اوپر جا کر بھی یہی دیکھا کہ اوپر کے نجوم و سیارات کے ادراک سے وہ بھی ایسے ہی عاجز و بے خبر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت انسان کو ایسے لایعنی مشغلے میں مبتلا کرنے سے گریز کرتے ہیں جن کا حاصل کرنا انسان کی قوت ادراک سے باہر ہے اور جن میں وہ اپنی عمر اور اس کی ساری توانائی اور اپنی ساری کمائی ضائع کرنے کے بعد بھی وہیں رہتا ہے جہاں پہلے تھا۔ اور جو کچھ جدید معلومات حاصل بھی ہو جائیں ان سے انسان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہاں پہلی دو حیثیتوں سے کائنات عالم میں غور کرنا انسان کے معاش و معاد کے لئے مفید بھی ہے، آسان بھی اور عادۃً بقدر ضرورت اس کو حاصل بھی ہو جاتا ہے۔

ایک مقناطیسی قوت ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس کی قوت کے

فوائد و ثمرات کی تحقیق تو آسان ہے اور سب کو معلوم ہے لیکن کوئی شخص اس کی علت اور حقیقت کے ادراک کو اپنا مشغلہ بنائے تو یقین ہے کہ قدیم کی طرح جدید سائنس بھی اپنی توانائی اور وقت ضائع کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہونچے گی جس پر قدیم فلاسفوں کا اقرار ہے کہ یہ راز نہیں کھلا کہ مقناطیس وزنی چیز لوہے کو کھینچتی ہے۔ اور ہلکی چیز کاغذ کپڑے کو نہیں کھینچتی۔ اور یہ کہ قطب شمالی سے اس کا کیا رابطہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سیارات کی حرکتوں سے پیدا ہونے والے صبح و شام، لیل و نہار کے اوقات کا حساب۔ اور چاند کے پیدا ہونے بڑھنے اور گھٹنے کا حساب شمس و قمر کے کسوف و خسوف کا حساب وغیرہ جو انسانی ضرورت سے متعلق ہیں ان کو سبھی ماہرین فلکیات اور فلاسفروں نے صحیح صحیح معلوم کرلیا اس میں قدیم و جدید تحقیقات میں کچھ زائد اختلاف بھی نہیں۔ آسمانوں اور ستاروں سیاروں کی حقیقت اور ہیئت میں فیثاغورس اور بطلیموس کے نظریات اور جدید ماہرین کے افکار کتنے ہی مختلف ہوں مگر جس قدر علم انسان کی ضروریات سے متعلق اس میں سب متفق ہیں

علامہ بخیت مفتی مصر نے اپنی کتاب توفیق الرحمٰن میں اسی لئے علم ہیئت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک وصفی جو اجرام سماویہ کی حرکات اور حسابات سے متعلق ہے، دوسرا عملی جو ان حسابات کو معلوم کرنے کے لئے آلات قدیمہ یا جدیدہ سے متعلق ہے، تیسرا طبیعی جو افلاک و سیارات کی ہیئت و حقیقت سے متعلق ہے اور لکھا ہے کہ ان میں سے پہلے دو حصوں میں ماہرین قدیم و جدید کے اختلاف کالعدم ہیں تقریباً اکثر امور میں آلات ادراک میں بہت بڑا اختلاف ہونے کے باوجود سب کا اتفاق ہے۔ اختلاف صرف تیسری قسم میں ہے اور وہ بھی نہایت شدید (ص ۲۹)

غور کیجئے تو انسانی ضروریات سے متعلق بھی پہلے ہی دو حصے ہیں تیسرا حصہ دور از کار بھی ہے مشکل بھی اور ایسا مشکل کہ اس کا پورا حل نہ قدیم نظریات والے کر سکے نہ جدید والے۔ اسی لئے عقل سلیم کا تقاضا بھی اس معاملے میں وہی ہے جو بزرگان سلف نے فرمایا ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو ٭ نینگیختن علت از کار تو
مہندس بسے جوید اسرار شان ٭ نداند کہ چوں کردی آغاز شان

اسی کے متعلق حافظ شیرازی نے فرمایا ؎

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

صوفیائے کرام جو نظر کشفی سے ان چیزوں کو دیکھتے ہیں ان کا فیصلہ بھی آخر میں وہی ہے جو سعدی شیرازی نے کہا ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم ٭ کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ کہ کائنات افلاک و فضا اور کائنات ارضی میں غور و فکر اس حیثیت سے کہ ان سے پیدا کرنے والے کے وجود۔ توحید۔ بیمثال علم و حکمت۔ قدرت و قوت پر استدلال کیا جائے۔ عین مقصود قرآن ہے اور قرآن بار بار اسکی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور اس حیثیت سے کہ ان سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے۔ یہ بھی ضرورت کی حد تک عین منشاء قرآنی ہے اور قرآن اس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ ضروریات انسانی سے زائد لگژری (اور محض عیش و عشرت) سے متعلق چیزوں میں غور و فکر اور انہماک کو پسند نہیں کرتا۔

اور تیسری حیثیت سے ان چیزوں کو غور و فکر کا مرکز بنانے اور اس میں عمر عزیز صرف کرنے سے گریز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان معاملات میں سائنس جدید کی ترقیات و تحقیقات کو عین منشاء قرآن کہنا بھی غلط ہے جیسا کہ حال کے بعض تجدد پسند علماء نے لکھا ہے اور قرآن کو اس کی مخالف کہنا بھی غلط ہے جیسا بعض قدامت پسند علماء نے کہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ قرآن ان حقائق کو بیان کرنا چاہتا ہے جو دوسری کا موضوع بحث ہیں اور نہ انسان کے لئے ان کی تحقیق کرنا آسان ہے اور نہ انسانی ضروریات ان کا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں ساکت ہے، اب اگر کچھ لوگ اس کی کھوج میں لگے ہیں اور وہ تجربات و مشاہدات سے کوئی چیز معلوم کرلیتے ہیں تو اس کو قرآن کے منافی اور خلاف کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے اوپر انسان کا پہنچنا، رہنا بسنا، اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اٹھانا وغیرہ یہ سب شاید اسی میں داخل ہیں ان میں کوئی چیز مشاہدہ سے ثابت ہوجائے تو انکار کرنے کی ضرورت

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت

یہ مقالہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ نے راولپنڈی کی بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کے لئے تحریر فرمایا تھا جو مورخہ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۰۰ھ کی صبح کو مذکورہ کانفرنس میں پڑھا گیا۔ مقالے کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے ایک ہی قسط میں شائع کر رہے ہیں، اس میں تقسیم دولت کے نظریئے پر ایک اچھوتے رُخ سے بحث کی گئی ہے امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ مقالہ اسلامی معاشیات کے طلباء و محققین کے لئے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولے گا۔ ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

"تقسیم دولت" کی بحث معاشی زندگی کے ان اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جنھوں نے آج کی دنیا میں عالمگیر انقلابات کو جنم دیا ہے، اور عالمی سیاست سے لیکر ایک فرد کی نجی زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ صدیوں سے اس موضوع پر زبانی، قلمی اور حربی معرکے گرم ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "وحی الٰہی" کی رہنمائی کے بغیر نری عقل کے بل پر اس موضوع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس نے اس الجھی ہوئی ڈور کے خم و پیچ میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔

زیر نظر مقالہ میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن و سنت اور مفکرین اسلام کی کاوشوں سے اس معاملے میں "اسلام" کا جو نقطۂ نظر سمجھ میں آسکا ہے اسے واضح کیا جائے۔ وقت کی تنگی اور صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس موضوع کو پورے بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ البتہ اس کے اہم نکات کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ عرض کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

قرآن و سنت اور اسلامی فقہ سے "تقسیم دولت" کے بارے میں اسلام کا جو موقف احقر نے سمجھا ہے اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں جو اسلامی معاشیات کے تقریباً ہر مسئلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں انھیں آپ "نظریۂ تقسیم دولت کے اصول" کہہ لیجئے۔ اس کا "فلسفہ" سمجھ لیجئے یا اس نظریئے کے مقاصد قرار دیجئے، بہرحال یہ چند ضروری باتیں ہیں جو قرآن کریم سے اصولی طور پر سمجھ میں آتی ہیں اور اسلام کے

معاشی طرزِ فکر کو غیر اسلامی معاشیات سے ممتاز کرتی ہیں۔

۱ معاشی مسئلے کا مقام

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز، مستحسن بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے۔ انسان کی معاشی ترقی اس کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور "کسبِ حلال" اس کے نزدیک "فریضة بعد الفریضة" کا مقام رکھتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی صداقت رکھتی ہے کہ اس کی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ "معاش" نہیں ہے اور نہ "معاشی ترقی" اس کے نزدیک انسان کا مقصدِ زندگی ہے۔

معمولی سمجھ بوجھ سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہوتی ہے اور اس کا مقصدِ زندگی اور محورِ فکر و عمل ہونا بالکل جدا چیز۔ اسلامی معاشیات کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں انہیں دو چیزوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے پہلے ہی قدم پر اس بات کا صاف ہونا ضروری ہے۔ درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادی معاشیات کے درمیان ایک بڑا ابھرا بنیادی اور دور رس فرق یہ ہے کہ مادی معاشیات میں "معاش" انسان کا بنیادی مسئلہ اور معاشی ترقیات اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں۔ اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور ناگزیر ہی سہی لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں ہیں۔ اس لئے جہاں ہمیں قرآن کریم میں "رہبانیت" کی مذمت اور وابتغوا من فضل اللہ کے احکام ملتے ہیں، جہاں ہمیں تجارت کے لئے "فضل اللہ" اموال کے لئے "خیر" اور "التی جعل اللہ لکم قیاما" خوراک کے لئے "الطیبات من الرزق" لباس کے لئے "زینة اللہ" اور رہائش کے لئے "سکن" کے اعزازی القاب ملتے ہیں، وہاں دنیوی زندگی کے لئے "متاع الغرور" کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان سب چیزوں کیلئے "الدنیا" کا لفظ بھی ملتا ہے۔ جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا۔ اور قرآن کریم کے مجموعی اسلوب سے بھی اس کی دناءت اور حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقع پر تضاد کا شبہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے پیچھے اصل راز یہی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائلِ معاش انسان کی رہگزر کے مرحلے ہیں۔ اس کی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود۔ انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد انہی دو منزلوں کی تحصیل ہے۔ لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گذرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا اس لئے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں جو اس کی دینوی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ جب تک وسائلِ معاش انسان کی اصلی منزل کے لئے رہگزر کا کام دیں وہ "فضل اللہ" "خیر" "من زینة اللہ" اور "سکن" ہیں لیکن اگر ا... اس رہگزر کی بھول بھلیاں میں الجھ کر رہ جائے۔ اور اس پر اپنی اصل منزلِ مقصود کو قربان کر ڈالے یا بالفاظ دیگر وسائلِ معاش کو "رہگزر" بنانے کے بجائے اپنی منزلِ مقصود کے راستے میں رکاو... بنا دے تو پھر یہی وسائلِ معاش "متاع الغرور" "فتنہ" اور "عدو" بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر سی آیت "وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرة" میں اسی بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں اہل علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، احقر کی ... میں "انسانی معاش" کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے دو مختلف پہلو نظر میں رہیں تو اسلامی معاشیات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے...

۲ - دولت اور ملکیت کی حقیقت

دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے "تقسیم دولت" کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ قرآن کریم کی نظر کے مطابق "دولت" خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے، سورۂ ...

میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"وآتوهم من مال الله الذی آتاکم"

"اور انہیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے"۔

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے۔ لیکن اس کوشش کو بار آور کرنا اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے لیکن اس بیج کو کونپل اور کونپل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے۔ ارشاد ہے۔

افرأیتم ما تحرثون ءأنتم تزرعونه ام نحن الزارعون۔

"دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو۔ کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے؟"

نیز ارشاد ہے۔

اولم یروا انا خلقنا لهم مما عملت ایدینا انعاما فهم لها مالکون

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے جانوروں کو اپنے ہاتھوں سے بنا کر پیدا کیا پھر یہ لوگ ان کے مالک بن گئے؟"

تمام آیات اسی بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ اور اسی کی عطا سے انسان کو ملی ہے۔ پھر اسلام کی نظر میں چونکہ "دولت" پر اصل ملکیت اللہ کی ہے۔ اور اسی نے انسان کو اس میں تصرف کا حق عطا کیا ہے لہٰذا اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو احکام کا پابند بنائے چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر "ملکیت" تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد خود مختار اور بے لگام نہیں ہے۔

اس پر دولت کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود اور پابندیاں عائد ہیں۔ جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیدے وہاں اس کے لئے خرچ کرنا ضروری ہے۔ اور جہاں خرچ کی ممانعت کر دے وہاں رک جانا لازم ہے۔ اس بات کو سورہ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔

وابتغ فیما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصیبك من الدنیا واحسن کما احسن الله الیك ولا تبغ الفساد فی الارض۔

جو کچھ تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلے گھر (آخرت کا توشہ) کمالے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے تجھ سے بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ۔"

اس آیت نے اسلام کے فلسفۂ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرما دیا ہے اس سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے وہ اللہ کی دی ہوئی ہے (آتاک اللہ)

(۲) انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اس کی منزل مقصود آخرت ہو (وابتغ ..... الدار الآخرۃ)

(۳) چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے تابع ہوگا۔ اب حکم خداوندی کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ یہ مال کسی دوسرے کو دیدو اس کی تعمیل اس لئے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے۔ تو وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے (واحسن کما احسن اللہ الیک)

(۴) دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے کسی تصرف سے منع کرے۔ اس کا بھی اس کو اختیار ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے

اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین میں شر و فساد پھیلے (ولا تبغ الفساد فی الارض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریۂ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے۔ وہ اس کو جس طرح چاہے رکھ سکتا ہے لیکن قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریہ کا مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ وہ لوگ کہا کرتے تھے:

اصلاتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء

"کیا تمہیں تمہاری نماز اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں"

وہ لوگ چونکہ "اموال" کو حقیقتاً "اپنا" (اموالنا) سمجھتے تھے اس لئے "نفعل ما نشاء" (جو چاہیں کریں) کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے۔ اور قرآن کریم نے سورۂ نور میں "اموالنا" (اپنے اموال) کے لفظ کو "مال اللہ" (اللہ کا مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اسی بنیاد پر ضرب لگائی ہے مگر اس کے ساتھ ہی "الذی آتاکم" (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔

اب اسلام اور سرمایہ داری و اشتراکیت کے درمیان واضح خط امتیاز اس طرح کھینچا جا سکتا ہے کہ

سرمایہ داری ——— آزاد اور خود مختار انفرادی ملکیت کی قائل ہے۔

اشتراکیت ——— انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے۔ اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان یہ ہے

مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

(۳) تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد

اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے اور جس کا خا[کہ] انشاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔

(الف) ایک قابل عمل نظم معیشت کا قیام

تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابل عمل ہو۔ اور جس میں ہر انسان جبر و تشدد کے بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت اپنی استعداد اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے۔ تاکہ اس کی خدمات زیادہ مؤثر، مفید اور صحت مند ہوں اور یہ بات مستاجر (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور "آجر" کے صحت مند رشتے اور "رسد و طلب" کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال[1] کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے اس بات کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے

"نحن قسمنا بینہم معیشتہم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضہم فوق بعض درجات لیتخذ بعضہم بعضاً سخریاً"

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے:"

[1] صحیح استعمال کی قید اس لئے بڑھائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے اور سرمایہ داری میں ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے قیدی کو ختم کر کے اسی غلط استعمال کو

(ب) **حق کا حقدار کو پہنچانا**

اسلام کے ..... نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کو حقدار کو پہنچانا ہے۔ لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔ مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں۔ انہیں کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور بس!

اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ چونکہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے اس لئے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار اور بیکس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں اس لئے کہ جن عوامل پیدائش ..... پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے ان کے ذمہ اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ وہ فی الواقع دولت کے مستحق ہیں۔ ارشاد ہے۔

"وفی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم"

"اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک متعین حق ہے۔"

اسی حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے کھیتوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے

"وآتوا حقہ یوم حصادہ"

"اور اس کھیتی کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو"

ان دونوں آیتوں میں "حق" کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا ماخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اسی طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اولین مالک۔

لہٰذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے۔ اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جنہیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے۔ (ان دونوں قسم کے حصہ داروں کی تفصیل آگے آرہی ہے)

(ج) **ارتکاز دولت کی بیخ کنی**

تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس پر اسلام نے بہت اہمیت دی ہے یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر گردش کرے۔ اور اس طرح امیر و غریب کا تفاوت جس حد تک فطری اور قابل عمل ہو کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا طرز عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اولین ماخذ اور ذرائع ہیں ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرہ نہیں بیٹھنے دیا، بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے۔ کانیں، جنگل، غیر مملوک بنجر زمینیں جنگل اور پانی کا شکار، خود رو گھاس۔ دریا اور سمندر وغیرہ یہ تمام پیدائش دولت کے اولین ماخذ ہیں اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری کا ....

"کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم"

"تاکہ یہ دولت تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔"

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور کوئی شخص اپنے کسب و عمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب و عمل کا احترام کر کے اس کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب و عمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے۔ اور اس معاملہ میں ارشاد ہو کہ

"نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا"

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم کیا ہے۔ اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت دی ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکے۔"

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدیئے گئے ہیں کہ یہ فرق۔ اسی قدر رہے جتنا ایک قابل عمل نظم معیشت کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں رہتا ہے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسرا دونوں سے جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظام

اسلامی نظم معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب میں مختصراً "تقسیم دولت" کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کروں گا جو قرآن و سنت اور فقہائے امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ

لیکن اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں "تقسیم دولت" کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے پہلے اس پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہو گا۔ مختصر لفظوں میں سرمایہ دارانہ نظریہ کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ دولت انہی لوگوں پر تقسیم ہونی چاہیے جنھوں نے اس کی پیداوار میں حصہ لیا ہے اور جنھیں معاشی اصطلاح کے مطابق "عاملین پیداوار" کہا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں۔

(۱) سرمایہ۔ جس کی تعریف "پیدا کردہ ذریعہ پیدائش" سے کی گئی ہے یعنی وہ شئے جس پر ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہو چکا ہو۔ اور اسے ایک دوسرے عمل پیدائش کے لئے ذریعہ بنایا جا رہا ہو۔

(۲) محنت : یعنی انسانی عمل۔

(۳) زمین : جس کی تعریف "قدرتی وسائل" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

(۴) آجر یا تنظیم : یعنی وہ چوتھا عامل جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انھیں کام میں لگاتا اور نفع نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترک عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے۔ اس کو انھیں چاروں پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو "[illegible]" کی شکل میں دیا جاتا ہے دوسرا حصہ محنت کو اجرت کی شکل میں دیا جاتا ہے تیسرا حصہ زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے۔ اور چوتھا حصہ آجر کے لئے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

لہ؛ واضح رہے کہ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حصول دولت کے اولین مآخذ میں سے ہے۔

تقسیم دولت کا اشتراکی نظریہ

اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کے بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے سود اور لگان کا اس نظام کے فلسفے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1] آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کے بجائے خود حکومت ہوتی ہے۔ اس لئے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے۔ اب صرف "محنت" رہ جاتی ہے اور اشتراکی نظام میں دولت کی وہی مستحق ہے جو اسے "اجرت" کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ

اسلام کا "نظام تقسیم دولت" ان دونوں سے مختلف ہے اس کے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہیں۔ ایک اولین مستحق یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلا واسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ مستحقین وہی عوامل پیداوار ہیں جنھوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا۔ دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے، لیکن عاملین پیدائش کے ذمہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

دولت کے اولین مستحق

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں لیکن عوامل پیداوار کی تعیین ان کی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہٖ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں مقرر کئے گئے ہیں، بلکہ بہت مختلف ہیں۔ اسلامی نظریئے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں۔

(۱) سرمایہ: یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انھیں خرچ نہ کیا جائے یا ان کی شکل وصورت میں تبدیلی نہ کی جائے۔ اور اس لئے ان کا کرایہ چلانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خوردنی وغیرہ۔

(۲) زمین۔ یعنی وہ وسائل پیداوار جن کو عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصلی شکل وصورت برقرار رہتی ہے، اور اسی لئے انھیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے جیسے زمین، مکان، مشینری وغیرہ۔

(۳) محنت یعنی انسانی فعل، خواہ وہ اعضاء وجوارح کا ہو، یا ذہن اور قلب کا۔ لہٰذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اولاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بہ شکل منافع (نہ کہ بہ شکل سود) ملے گا۔ دوسرا حصہ زمین کو بہ شکل کرایہ دیا جائے گا۔ اور تیسرا حصہ محنت کو بہ شکل اجرت۔

اشتراکیت اور اسلام

تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے۔ اور سرمایہ داری سے بھی۔ اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اس لئے اس میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے جو اصول ہم نے بیان کئے ہیں ان کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دیا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خود رو گھاس، جنگل اور پانی کا شکار، معادن اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ اسی قسم میں داخل ہیں جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں۔ بلکہ وہ وقف عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

---

[1] یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے۔ اس کے موجودہ عمل سے نہیں۔ اشتراکی ممالک کا موجودہ طرز عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کئے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظام معیشت قائم نہیں ہو سکتا جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے۔ اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو کلیۃً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ مآل کار اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بیشمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالہ کرنا پڑتا ہے جو من مانے طور پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے اور اس طرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکاز دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے استعمال کے لئے جبر و تشدد ناگزیر ہے۔ جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اس کی ذہنی صحت پر بھی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں ایک فطری نظم معیشت کا قیام اور دوسرے حقدار کو حق پہنچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر ڈالنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقف عام نہیں ہیں ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے۔ اور ان میں "رسد و طلب" کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے "سود" کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے۔ اور جسے دور کرنے کا دعویٰ اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام

یہ تھا اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اس لئے اسے نسبۃً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کئے ہیں ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں۔

(۱) عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کئے گئے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲) سرمایہ کا صلہ "سود" کے بجائے "منافع" قرار دیا گیا ہے۔

(۳) عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں "سرمایہ" کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں "پیدا شدہ ذریعہ پیدائش" سے کی جاتی ہے۔ لہٰذا نقد روپیہ اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے لیکن ہم نے اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے "سرمایہ" کی جو تعریف کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنہیں خرچ کئے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں، یا بالفاظ دیگر جنہیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا مثلاً روپیہ مشینری اس تعریف کی رو سے "سرمایہ" میں داخل نہیں۔

(۴) اسی طرح "زمین" کی تعریف زیادہ عام کر دی گئی ہے

یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہو گئی ہے۔

(۵) محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں ذہنی محنت۔ اور منصوبہ بندی بھی شامل ہو گئی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بناء پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع و نقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے "منافع" اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے گا کیونکہ باقی تینوں عوامل پیدائش میں سے سرمایہ کو معین سود۔ زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اجرت مل جاتی ہے۔ اس لئے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ درحقیقت "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہئے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے اس کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس لئے جو سرمایہ دار ہے وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) **انفرادی کاروبار**۔ سرمایہ لگانے والا بلا شرکتِ غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے۔ اس صورت میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" کہلائے، لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ سرمایہ لگانے کی وجہ سے "منافع" کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے "اجرت" کا۔

(۲) **شرکت**: دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں، کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع و نقصان میں بھی۔ اسے فقہی اصطلاح میں "شرکۃ العقود" کہا جاتا ہے۔

اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء، سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حقدار ہوں گے۔ اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اجرت" کے۔ یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا۔ آپ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا۔ اور اس کے جواز پر اجماع منعقد ہو گیا[1]۔

(۳) **مضاربت**: تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے۔ اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ اسے فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے (رب المال) کو اس کا حصہ "نفع" کی صورت میں ملے گا اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو "اجرت" کی صورت میں۔ ہاں اگر کاروبار چلانے والے (مضارب) کو ....

... کاروبار میں نقصان ہو جائے تو جس طرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا اسی طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔

یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا[2]۔ اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہائے امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے[3]۔ ان تین

---

[1] ملاحظہ ہو المبسوط للسرخسی ص ۱۵۱ ج ۱۱ مطبع السعادۃ مصر
[2] زرقانی شرح المواہب ص ۲۰۰ ج ۱ اول الازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ
[3] المبسوط للسرخسی ص ۱۰ ج ۲۲

صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار

شغل سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے رائج چلی آتی ہے۔ سود کا کاروبار ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے۔ دوسرا محنت کرے۔ نقصان ہو تو محنت کا ہو۔ اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا ہے۔ اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے

"یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین۔ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ"

"اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو"

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ

"فان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون"

"پس اگر تم سود سے توبہ کرو تو تمہیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو۔ نہ کوئی تم پر ظلم کرے"

ان دو آیتوں میں "ما بقی من الربوا" اور "فلکم رؤس اموالکم" کے الفاظ نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف کر دی ہے کہ سود کی ادنیٰ سی مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف "رأس المال" واپس ملے۔ لہٰذا اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں کو سود پر قرض لیکر کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا۔ ابن جریج فرماتے ہیں۔

"کانت بنو عمرو بن عوف یاخذون الربا من بنی المغیرۃ وکانت بنو المغیرۃ یربون لہم فی الجاہلیۃ فجاء الاسلام ولہم علیہم مال کثیر"

"جاہلیت میں بنو عمرو بن عوف بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے تھے اور بنو المغیرہ انھیں سود دیتے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب تھا

اور

"کان بنو المغیرۃ یربون لثقیف"

"بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے"

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں اس لئے ایک قبیلے سے دوسرے قبیلہ کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً کاروبار کے لئے ہوتا تھا اور اس کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دیدیا۔

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کسی کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کے لئے دینا چاہتا ہے اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لئے دے رہا ہے۔ یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے؟ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑے گی۔ کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا۔ اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے خسارہ میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے۔ اور نفع کے ہر مطالبہ سے دستبردار ہو جائے۔ وہ صرف اتنے ہی روپیہ کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دیئے تھے۔ اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے "سود" کی ایک شرح متعین

کہ نقصان کا سارا بوجھ مقروض پر ڈالے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اسلام میں "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی ذمہ داری "سرمایہ" پر ہے، جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائے گا اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا ۱؎، لہٰذا اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیسا کہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے) کہ وہ "خطرہ مول لیتا ہے" تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت "سرمایہ" کی ہے۔ اس لئے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں، اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے نہ کہ سود۔

اور اگر آجر کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے (جیسا کہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے) تو پھر یہ کام "محنت" میں داخل ہے۔ اور اسے الگ عامل پیداوار سمجھنا طول لاطائل ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق

مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام کی رو سے منافع اور اجرت جائز ہے اور سود ناجائز۔ اب چوتھی چیز "کرایہ" رہجاتی ہے۔ اسلام نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے۔ بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین متعین ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی متعین ہوتا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لئے پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنہیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ، کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ان سے مستفید ہونے کے لئے انہیں خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا۔ ایسی چیزیں چونکہ بذات خود قابل استفادہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے بہت سے فوائد وہ ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے کرایہ پر لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی۔ دوسری طرف ان کے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے۔ اس لئے ان کے منافع کی اجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے۔ اور اسی "منافع" کی اجرت کو اسلام "کرایہ" کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اس وقت تک نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ اس سے کوئی چیز خرید نہ لی جائے۔ لہٰذا روپیہ چونکہ بذات خود قابل استفادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک طرف اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہے اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے اس پر کوئی معین "شرح سود" مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجت مند کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا کاروبار کرے۔ لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین "شرح" سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی بنا پر ہم نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذات خود خرچ کئے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں وہ "سرمایہ" کہلائیں گی اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو "منافع" کی مستحق ہوں گی اور جو چیزیں خرچ کئے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں وہ "زمین" کہلائیں گی اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انہیں "کرایہ" کی صورت میں دولت تقسیم کی جائے گی۔

حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ

۱؎ اگر کسی شخص نے قرض حسن لے کر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے اور دائن کیساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہوگیا اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے اس لئے نقصان کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی۔

سرمایہ دارانہ معاشیات میں سود جائز ہے اور اسلام میں ناجائز، اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا کہ حرمت سود کے معاشی اثرات کیا ہیں؟

یوں تو "سود" کی حرمت سے "پیدائش دولت" کے نظام پر بھی بڑے گہرے دوررس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں، لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے یہاں اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کئے جاتے ہیں جو "تقسیم دولت" کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔ حرمت سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سودی نظام معاشیات کا یہ خاصہ "لازمہ" ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو متعین صورت میں بہرحال کھرا رہتا ہے۔ لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق (محنت) کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے۔ وسیع پیمانے کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں انہیں بہرحال "خطرے" سے خالی نہیں کہا جا سکتا بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانے کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں۔ وہاں کچھ خارجی عوامل کی بنا پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے۔ یہ خطرات بھی اتنے ہی وسیع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لیکن قرض دینے والے کی تجوری بھرتی ہی چلی گئی اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ تاجر کو بے انتہا منافع ہوا اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ مل سکا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے اس لئے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی صرف دو صورتیں ہوں گی۔ شرکت اور مضاربت۔ اور یہ دونوں صورتیں تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں۔ ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے تو فریقین کو ہوتا ہے اور نفع ہوتا ہے تو دونوں فریق متناسب طریقے سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "ارتکاز دولت" جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بدترین خرابی ہے۔ اس طریقے کی بدولت اس کی بڑی حد تک موثر روک تھام ہو جاتی ہے۔ اور دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاش کے افراد میں اس طرح پھیلتا ہے کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ سرمایہ داری میں سود کی وجہ سے سرمایہ دار صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خود غرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں "رسد اشیاء" اور "قیمتوں" کا نظام بھی قدرتی رہنے کے بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے۔ اور معیشت و اخلاق سے لے کر ملکی سیاست تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے "سود" کو ممنوع قرار دے کر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے۔ اسلامی نظام میں ہر روپیہ لگانے والا کاروبار اور اس کی پالیسی میں شریک ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتا ہے۔ اور اس طرح اس کی کاروباری مہم بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا "سود" کے نقصانات کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے اس پر بعض حضرات کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہنچتا ہے وہ اس کی مرضی سے پہنچتا ہے اور جب وہ خود خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو اس میں قانون شریعت کیوں دخل انداز ہوتا ہے؟

حالانکہ ذرا سا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ کسی معاملہ کی وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر راضی ہو تو یہ بات قاتل کو جرم

بری نہیں کر سکتی، یہاں تک کہ "زنا" جسے مغربی تہذیب کی تنگ نظری نے خالص نجی زندگی کا مسئلہ سمجھا ہوا ہے۔ اس میں بھی فریقین کی رضامندی مجرموں کو بری نہیں کر سکتی۔ دولت کی تقسیم اور معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو اس سے کچھ آگے ہی ہے شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جا چکا ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے وہ آزاد اور بے لگام ہونے کے بجائے اصولوں کی پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے۔ یا جس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑ سکتا ہے۔ اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا۔ احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود جو "تلقی الجلب" "بیع الحاضر للباد" "محاقلہ" "مزابنہ" اور "مخابرہ" وغیرہ کی شدید ممانعت آئی ہے۔ اس کے پیچھے یہی حکمت کارفرما ہے۔ اس لئے "سود" کے معاملہ کو بھی محض اس بنا پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں۔

جاہلیت کے لوگ حرمت سود پر اس قسم کا اعتراض کیا کرتے تھے کہ:۔

"انما البیع مثل الربوا"

"بیع ربوا ہی کی طرح تو ہے"

قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ

"واحل اللہ البیع وحرم الربوا"

"اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام"

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کے جواب میں "حرمت سود" کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی۔ بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے۔ تو خواہ اس کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس حکم کو ماننا پڑے گا۔ یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کے بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے حرمت سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کی حرمت اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد اشتراکیت کے مستبد اور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ اعتدال کی راہ ہے جو موجودہ دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلا کر ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسینون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں
اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل محفوظ اور
درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دیکر
اس پر عمل بھی کرا رہا ہو[1]۔

اجرتوں کا مسئلہ

یہاں تک تقسیم دولت کے معاملہ میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے اور وہ ہے مسئلہ سود۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے۔ اور اس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے اس کی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعیین کے مسائل تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرض اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے۔ اس لئے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک کھردرا اور رسمی تعلق ہے جس کی بنیاد خالص خود غرضی پر

[1] ڈاکٹر یوسف الدین۔ اسلام کے معاشی نظریئے ص ۴۴۳ ج ۲ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ انجمن علمائے قرضہ حسنہ کی اہمیت مجلہ جامعہ عثمانیہ ج ۵، حصہ معاشیات ج ۲ سنہ ۱۹۳۳ء

استوار ہوتی ہے۔ آجر صرف اسی حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے جب تک وہ اپنے کاروبار کے لئے اس کے ہاتھوں مجبور ہے۔ لہٰذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے۔ دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اس کے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو لہٰذا جہاں اس کی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ابدی کشمکش قائم رہتی ہے اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے، لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کردی ہیں کہ ان کا کاروباری رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے۔ آجر کا نقطۂ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہئے؟ اس کو قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرما دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے "آجر" تھے اور انہوں نے فرمایا۔

"وما ارید ان اشق علیک ستجدنی
ان شاء اللہ من الصالحین"

"میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں چاہتا
خدا نے چاہا تو تم مجھے نیکوکار پاؤ گے"

اس آیت نے واضح فرما دیا کہ ایک مسلمان آجر جس کی اصلی منزل مقصود "صالح" ہونا ہے اس وقت تک "صالح" نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اس طرح کھول دیا ہے کہ۔

"ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت
ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ
مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما
یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فاعینوھم"[1]

"تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنہیں اللہ نے تمہارا زیردست کیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کا بھائی اس کا ماتحت ہو اسے چاہئے کہ جو کچھ وہ خود کھائے اس میں سے اسے بھی کھلائے اور جو خود پہنے اسی میں سے اس کو بھی پہنائے اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔ اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو"

نیز ارشاد فرمایا کہ

"اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ"[2]

"مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو"

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہوں گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے کہ

"رجل استاجر اجیراً فاستوفی منہ
ولم یعطہ اجرہ"[3]

"وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے، پھر اس سے کام پورا لے۔ اور اس کو اس کی اجرت نہ دے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدور کے حق کا کس قدر احساس تھا۔ اس کا اندازہ حضرت علی رض کی ایک روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپ کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم"[4]

"نماز کا خیال رکھو۔ اور ان لوگوں کے حقوق کا جو تمہارے زیردست ہیں"

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق ص ۳۴۹ ج اول

[2] ابن ماجہ و طبرانی عن ابن عمر جمع الفوائد ص ۲۵۹ جلد اول میرٹھ ۱۳۴۶ھ

[3] صحیح بخاری کتاب الاجارہ بروایت ابو ہریرہ ص ۳۰۲ جلد اول

[4] ابن ماجہ (جمع الفوائد ص ۲۹۲ جلد اول)

ان ہدایات کے نتیجے میں "مزدور" کو اسلامی معاشرہ میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا اس کی بے شمار مثالیں قرونِ اولیٰ کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ "مزدور" کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے "اجیر" کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات کو مزید خوشگوار کردیا ہے۔ مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے جس کی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے نہیں کرنی ہے۔ بلکہ اس کی اصل منزلِ مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اس پر موقوف ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

"یا ایہا الذین امنوا اوفوا بالعقود"

"اے ایمان والو، تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو"

اور

"ان خیر من استاجرت القوی الامین"

"بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی"

نیز ارشاد ہے۔

"ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اووزنوھم یخسرون"

"دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کرتے ہیں اور جب انھیں ناپ یا تول کر دینے کا موقع آئے تو کمی کر جائیں"

فقہائے امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت میں "تطفیف" یا ناپ تول میں کمی کرنے والے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہو جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو دیدیئے ہیں، انھیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لئے ان احکام نے "کام چوری" کو گناہِ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ جتلا دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے، اس کی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے۔ اور اس کے ذمے ضروری ہے کہ وہ پوری دیانتداری، مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے۔ ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کرسکے گا جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے مسئلے میں "رسد و طلب" کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کے لئے کچھ ایسے احکام دیدیئے ہیں کہ ان کی وجہ سے "رسد و طلب" کا یہ نظام خود غرضی کے بجائے اخوت و ہمدردی پر مبنی ہوگیا ہے۔

ہوسکتا ہے یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لئے قرآن و سنت نے جو احکام دیئے ہیں ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے، جو خالص معاشی اور قانونی نقطۂ نظر سے خارج از بحث ہیں ــــــ لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط رہ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی۔ اس کے ہر شعبہ کا صحیح رو کار اسی وقت سامنے آسکتا ہے جب اسے اس کے مجموعی نظامِ زندگی میں فٹ کرکے دیکھا جائے اس لئے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں اس لئے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "عقیدۂ آخرت" ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔

قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کے ساتھ "خوفِ خدا" اور "فکرِ آخرت" کے مضامین لگے ہوئے ہیں۔ اس میں اصلی راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جا سکتی، تا وقتیکہ انسان کی ہر نقل و حرکت اور ہر فکر و عمل پر پہرہ دینے کے لئے "فکرِ آخرت" موجود نہ ہو۔ یوں تو دنیا کی ہزار سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس ناقابلِ انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے۔ کہ جس رفتار سے قانونی مشینریوں میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور "آجر" کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے درست ہو سکیں گے انتہا درجہ کی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اس کا اصلی علاج صرف اور صرف "فکرِ آخرت" ہے اور اسلام نے اس معاملہ میں اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے الٹ پھیر میں الجھ کر مادے کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ اس کے لئے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو لیکن یقین ہے کہ اگر امن و سکون انسانیت کے لئے مقدر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھا کر بالآخر اس حقیقت تک پہنچے گی جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کار فرما تھا، اس وقت دنیا اس قرآنی نظریہ کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے۔ اس دور کی تاریخ میں "آجر" اور "اجیر" کے جھگڑوں کی یہ کیفیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصہ سے پوری دنیا کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ قرآن و سنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں جنہوں نے اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر کے دکھا دیا اور جن کی وجہ سے اسلام کے قرونِ اولیٰ کی تاریخ آج کے جبر و تشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے

تقسیمِ دولت کے ثانوی مدات

اب تک ہماری بحث تقسیمِ دولت کے اولین حقداروں کے متعلق تھی۔ اسلامی نظریۂ تقسیمِ دولت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرے کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو کام کے قابل بنانے کے لئے عاملینِ پیداوار کے ساتھ دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ اور اس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف اشارے کئے جا چکے ہیں کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اسی نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کئے ہیں انسان کو اس کے کسب و عمل کا جو بھی صلہ ملتا ہے وہ اس کا مالک ضرور ہے لیکن چونکہ کسب و عمل کی تمام تر توفیق اللہ ہی دیتا ہے اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے۔ اس لئے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دیدے انسان کیلئے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس بنیادی نظریے سے عمل پیدائش کے علاوہ استحقاقِ دولت کی ایک دوسری مد خود بخود نکل آتی ہے۔ یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمہ فرض قرار دیا ہے۔ اس طرح تقسیمِ دولت کے ثانوی مدات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔ جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کر کے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے اور ارتکازِ دولت پر جو پابندیاں "سود" کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں ان کو مزید توسیع دی جائے۔ ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم انھیں اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے

(۱) زکوٰۃ

ان میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد "زکوٰۃ" ہے۔

"قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس فریضہ کو "نماز" کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو سونے چاندی، مویشی اور مال تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو۔ اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ سال گذرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے۔ اور جو شخص اس فریضہ کو ادا نہ کرے اس کے لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:۔

"الذین یکنزون الذھب والفضۃ
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم
بعذاب الیم یوم یحمیٰ علیھا فی نار
جھنم فتکویٰ بھا جباھھم وجنوبھم
وظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم
فذوقوا ما کنتم تکنزون۔"

جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائیگا پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔

پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دیئے ہیں۔

اس طرح "زکوٰۃ" کے اس ایک مد کے لئے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآن کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

"زکوٰۃ" کے مصارف میں استحقاق کی قدر مشترک "ناداری" اور "افلاس" ہے اور اس مد میں افلاس ہی کے خاتمہ پر زور دیا گیا ہے۔ اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان کس قدر وسیع پیمانہ پر تقسیم دولت ممکن ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب تیس کروڑ روپے تھی زکوٰۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۲٫۵ فیصد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوٰۃ نکالی جائے تو کم از کم اڑتیس کروڑ پچیس لاکھ روپے سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام عاملین پیداوار ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہنچتی ہے۔ اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہو سکتی ہے۔

۲۔ عشر

"عشر" درحقیقت زمینی پیداوار کی "زکوٰۃ" ہے لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبۃً کم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی شرح ۲٫۵ فیصد کے بجائے ۱۰ فی صد رکھی گئی ہے۔ "عشر" صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں اور اس کو زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۳۔ کفارات

معاشرے کے سینکڑوں افراد تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے، یا کسی مسلمان کو بلا عمد قتل کر دے یا اپنی بیوی سے ظہار کرے یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا کچھ حصہ ناداروں پر خرچ کرے۔ یہ نقد روپے کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

۴۔ صدقۃ الفطر

اس کے علاوہ جو لوگ صاحب نصاب ہوں ان کے لئے عید الفطر کے موقع پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت مفلسوں ناداروں یتیموں

ر بیواؤں پر خرچ کریں، یہ رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ
ی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے، اور اس کے
جوب کے لئے مقدارِ نصاب کا "نامی" ہونا یا اس پر پورا
سال گذرنا بھی ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس فریضہ کا دائرہ زکوٰۃ
سے بھی زیادہ وسیع ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ خاص طور سے
یک اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا
کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت
تقسیم کرنے کے لئے تھیں۔ اس کے علاوہ دو مدّیں ہیں جن سے
اعزہ واقربا کی امداد اور ان تک دولت کا پہنچانا مقصود ہے
ان میں سے ایک مد نفقات کی ہے۔ اور دوسری وراثت کی

۵۔ نفقات

اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ
اپنے خاص خاص رشتے داروں کی معاشی کفالت کرے، پھر
ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی کفالت بہرصورت واجب ہے
خواہ انسان تنگدست ہو یا خوش حال مثلاً بیوی نابالغ اولاد،
اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ
مشروط ہے، ایسے رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست اسلامی
فقہ میں موجود ہے، اور اس کے ذریعہ خاندان کے اپاہج، کمزور
افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

۶۔ وراثت

اسلام کا نظام وراثت، اس کے نظریۂ تقسیم دولت میں
ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے، وراثت کی مرتکز تقسیم سے تقسیم
دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔
مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہی
ہے جس کا اقرار بہت سے ماہرین معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبر الاولاد کی جانشینی کا طریقہ رائج
ہے، جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے، باقی سب
محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض مقامات پر اگر مرنے والا چاہے
تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت
کر سکتا ہے، اور اس سلسلہ میں اُسے مذکر اولاد کو بھی محروم
کرنے کا حق ہے۔ اس طریقہ کے نتیجہ میں دولت پھیلنے کے
بجائے سمٹتی ہے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں تقسیم وراثت
کو مردوں میں تو اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے، لیکن
عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں جس سے ان پر
ظلم ہونے کے علاوہ گردش دولت کا دائرہ اسلام کی بہ نسبت
سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیم وراثت کا جو نظام بنایا
ہے اس میں ان تمام خرابیوں کا انسداد ہو جاتا ہے، اس
نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست
رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانہ پر پھیلتی
ہے۔ یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے
پیش نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم
کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے لیکن اس صورت
میں ہر مرنیوالا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال
ختم کر جائے۔ اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا
ہو جاتی۔ اس لئے اسلام نے اُسے میت کے رشتہ داروں میں
تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے جو مالک سرمایہ کی فطری خواہش ہے

(۲) دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف
عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کا
ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا۔ (النساء)

مردوں کے لئے (بھی) ایک حصہ ہے اس مال میں
جو والدین اور اقربا چھوڑ کر جائیں اور عورتوں کیلئے
بھی ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقارب

چھوڑ کر جائیں، تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں سے بھی ایک معین حصہ ہے۔

(۳) مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی کے حصہ میں ترمیم کر سکے۔ اس طرح وراثت کے راستے سے ارتکاز دولت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ۔

تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار سے تم سے قریب تر ہے؟ تم نہیں جانتے! یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔

(۴) چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی بلکہ سب کو برابر حصہ دیا گیا ہے۔

(۵) کسی وارث کے لئے اس کے حصۂ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنے حصۂ وراثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا۔

(۶) متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے وصیت کر جائیں۔ اس سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے۔ اور تقسیم وراثت سے قبل دولت کا ایک حصہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے۔

(۷) لیکن وصیت کرنے والے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیت کر جائے۔ بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے زیادہ کی وصیت کا وہ مجاز نہیں۔ اس طرح ارتکاز دولت کے اس خطرے کا سدباب بھی کر دیا گیا ہے۔ جو پورے مال کی وصیت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا۔ اور اقرباء کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔

۸۔ خراج اور جزیہ — مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مد ایسے ہیں جن میں مالکان دولت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومت وقت کو ادا کریں ایک خراج اور دوسرا جزیہ۔

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں اور اس کو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کر سکتی ہے۔ اور جزیہ ایک تو ان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں۔ اور حکومت نے ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو۔ دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اور پر تقسیم دولت کے جو ثانوی مدات بیان کئے گئے ہیں یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اولین مالکوں کے ذمے شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے، غرباء و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں آپ فرما دیجئے کہ جو زائد ہے۔

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جس قدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں؛ قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام و فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔

پیشہ وارانہ گداگری کا انسداد

معاشرہ کے گروہ افراد کو سرمایہ داروں کے اموال میں حق دلانے سے دوسری طرف معاشرہ میں اس خرابی کے امکانات تھے کہ معاشرہ کا یہ طبقہ مفلوج ہو کر ہمیشہ قوم پر بار بنا رہے۔ شریعت اسلام نے اس پر بھی گہری نظر

ے ان کو بھی خاص قانون کا پابند بنایا ہے کہ

(۱) تندرست توانا آدمی کو بجز مخصوص حالات کے سوال کرنے کا حق نہیں دیا، قرآن کریم نے "فقراء" کی قابل تعریف صفت یہ بیان کی گئی ہو کہ "وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے"

(۲) جس شخص کے پاس ایک دن کے گذارہ کا سامان موجود ہو اس کے لئے سوال حرام کر دیا۔

(۳) سوال کرنے کو حدیث میں ذلت قرار دیا ہے۔

(۴) جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو اس کے لئے بغیر سوال کے بھی صدقہ لینا حرام کر دیا۔

(۵) غرباء و مساکین کو اس کی ترغیب دی کہ محنت مزدوری کی کمائی کو عزت سمجھیں صدقات سے گریز کریں۔

(۶) ارباب اموال کو اس کی ہدایت کی اموال صدقات صرف اپنی جیب سے نکال کافی نہیں۔ بلکہ اس کے مستحقین حاجتمند لوگوں کو تلاش کر کے ان کو پہنچانا بھی ان کی ذمہ داری ہے

(۷) محکمہ احتساب کے ذریعہ گداگری کا انسداد کیا گیا۔

ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجہ میں ہماری تاریخ کے اندر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ معاشرے میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔

یہ اسلامی نظام تقسیم دولت کے چند نمایاں خدوخال تھے، اس مختصر مقالہ میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جاسکتی تھی، لیکن امید ہے کہ ان گذارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اس معاملے میں اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کس طرح ممتاز ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔

وللہ الحمد اولہ وآخرہ وظاہرہ وباطنہ

بندہ محمد شفیع۔ خادم دارالعلوم کراچی ۱۴

یکم ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق یکم فروری ۱۹۶۸ء

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس

پانچ روز کی ڈائری

محمد تقی عثمانی

۹ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق ۹ فروری ۱۹۶۸ء

رمضان المبارک سے شہرہ ہے کہ فروری میں وزارت قانون کی طرف سے ایک عالمی کانفرنس ..... منعقد ہو رہی ہے جس کے لئے دنیائے اسلام کے ہر گوشے سے اہم شخصیتوں کو مدعو کیا گیا ہے، کانفرنس کا پروگرام اور اس کے زیر غور موضوعات بڑے دلچسپ ہیں۔ اس کانفرنس کا افادی پہلو تو یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے جو تقریباً پورے عالم اسلام میں عرصے سے زیر بحث چلے آ رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی چونکہ اس کانفرنس کا انعقاد "ادارہ تحقیقات اسلامی" کی جانب سے ہو رہا ہے جس نے اپنی اب تک کی کارگزاریوں سے عوام میں سخت بے اعتمادی پیدا کر دی ہے۔ اس لئے عام ذہنوں میں یہ خلش بھی بڑی شدت کیساتھ محسوس ہو رہی ہے کہ ؏

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

کانفرنس ۱۰ فروری سے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں شروع ہونیوالی ہے، اور چار دن جاری رہیگی۔ صبح کو ۹ بجے سے ایک بجے تک کھلے اجلاسات رکھے گئے ہیں، جن میں مختلف علمی موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں گے۔ اور شام کو دو بجے سے بند کمروں میں مخصوص کمیٹیوں کے اجلاسات ہوں گے جن میں عائلی قوانین، بینکاری، اور انسان کے بنیادی حقوق کے مسائل پر غور و فکر کیا جائے گا۔

میں جب کل شام (۱۰ فروری کو) راولپنڈی پہنچا تو عبوری دار الحکومت مسلسل بارشوں کی بنا پر برفستان بنا ہوا تھا، شہر کے لکھے پڑھے حلقوں میں ہونے والی کانفرنس عام موضوعِ بحث تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا شہر اس کے لئے سراپا انتظار ہے۔ کل کی رات تو کراچی کے مرنجان مرنج موسم کو یاد کرتے ہی گذر گئی۔ آج صبح سویرے کانفرنس کے بہت سے مندوبین راولپنڈی پہنچنے والے تھے۔ جن میں میرے کئی بزرگ اور کئی دوست بھی شامل تھے۔ اس لئے صبح ناشتہ کرتے ہی ہم چکلالہ کے ہوائی اڈے پہنچ گئے۔ ٹھیک پونے نو بجے پی آئی اے کا طیارہ زمین پر اترا، غیر ملکی مندوبین میں سے مفتی اعظم فلسطین الحاج محمد امین الحسینی، مفتی اعظم تاشقند جناب ضیاء الدین بابا خانوف، شام کے شیخ احمد کفتارو، تیونس کے جناب کمال التارزی، ترکی کے ڈاکٹر ذکی ولیدی طوغان، لبنان کے ڈاکٹر عمر فروخ وغیرہ سے وی آئی پی روم میں ملاقات ہوئی۔ اور پاکستان میں علماء میں سے حضرۃ الشیخ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دامت برکاتہم اور جناب مولانا عبد الحامد صاحب بدایونی وغیرہ بھی اسی جہاز سے تشریف لائے تھے۔

ان حضرات کے استقبال کے لئے حضرت مولانا غلام اللہ خاں صاحب مدظلہم مہتمم دار العلوم تعلیم القرآن راولپنڈی بھی ہوائی اڈے پر موجود تھے۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب دامت برکاتہم نے ان سے وعدہ کرلیا کہ وہ جمعہ کی نماز ان کے مدرسہ میں پڑھائیں گے اس کے بعد ان کی دعوت پر مفتی اعظم فلسطین نے بھی وہیں پر جمعہ کی نماز پڑھنا منظور کرلیا۔

مدرسہ تعلیم القرآن میں

چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد میں مفتی اعظم فلسطین کے ہمراہ دارالعلوم تعلیم القرآن کی جامع مسجد میں پہنچا، حضرت مولانا بنوری صاحب مدظلہم خطاب فرمارہے تھے، میں نے ہوٹل سے تیونس کے جناب کمال التارزی کو بھی ساتھ لے لیا تھا نماز جمعہ کے بعد انہوں نے ایک پُرجوش تقریر کی اور المیہ بیت المقدس کے اسباب یاد دلاکر بے شمار آنکھوں کو اشکبار کردیا، مفتی صاحب نے دعا کرائی اور اس کے بعد حضرت مولانا غلام اللہ خاں صاحب ہم سب کو اپنے مہمان خانے میں لے گئے، جہاں اطراف واکناف کے بہت سے اہل علم جمع تھے، تقریر کا کوئی پروگرام نہ تھا، مگر انہیں دیکھ کر مفتی صاحب کی طبیعت خطاب کے لئے خود بخود آمادہ ہوگئی۔ انہوں نے فرمایا کہ:

"مسلمانوں کا زوال خلافت عثمانیہ کے سقوط سے شروع ہوا ہے، دشمنان اسلام کے اس عیارانہ حربے نے مسلمانوں کے اتحاد کو اس بری طرح پارہ پارہ کردیا کہ وہ ان گنت ٹکڑوں میں بٹ گئے۔"

انہوں نے کہا کہ خلافت عثمانیہ کے بعد پاکستان ایک ایسی اسلامی مملکت ہے جو نعرۂ اسلام کے نام پر وجود میں آئی ہے اور اس وقت پورے عالم اسلام کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام کو یہ بات بہت کھلتی ہے اور وہ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح اس ملک میں قومی اور صوبائی تعصب کا فتنہ جگا کر اس کی مثالی وحدت کو توڑ دیں۔

انہوں نے کہا کہ آپ حضرات کو میری آخری وصیت یہ ہے کہ کسی قیمت پر اس دام فریب میں نہ آئیں، اور قومیت ووطنیت کے بت کو اپنی آستینوں میں جگہ نہ دیں۔

دینی مدارس کا کردار

اس کے بعد انہوں نے برصغیر کے دینی مدارس کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سادہ مگر باوقار درسگاہوں نے انگریزی استعمار کے تاریک دور میں دین کی شمع روشن رکھنے کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ ناقابل فراموش ہے، مجھے ان درسگاہوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دشمنان اسلام اس وقت دین کے خلاف جو ثقافتی جنگ لڑرہے ہیں، یہ مدارس اس جنگ میں دین کے مضبوط حصار بنے ہوئے ہیں، اور انہیں ہر اعتبار سے مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی ضرورت ہے۔

عصر تک مفتی صاحب اسی موضوع پر خطاب فرماتے رہے۔

عصر کے بعد ہم لوگ واپس ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل پہنچے تو وہاں کانفرنس کے مزید بہت سے مندوبین پہنچ چکے تھے، نیچے کی منزل میں دو کمرے نماز کے لئے مخصوص کر دیئے گئے تھے، میں مغرب کی نماز کے لئے اپنے کمرے سے نیچے اترا تو ہوٹل کا لانج مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، نماز کے بعد حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب (ملتان) مدظلہم سے بھی ملاقات ہوئی، یہ دونوں حضرات بھی شام کے طیارے سے یہاں پہنچے تھے، متحدہ عرب جمہوریہ کے ڈاکٹر محمود فتح اللہ حب اللہ رئیس مجمع البحوث الاسلامیۃ اور جامعۃ الازہر کے مدیر جناب باقوری بھی آچکے تھے، پھر رات گئے تک ملکی وغیر ملکی مندوبین سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

---

۱۰ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

آج صبح ناشتہ کے بعد پروگرام کے مطابق مندوبین کو ٹیکسلا جانا تھا، لیکن مجھے شہر میں کچھ کام تھا، اس لئے میں ٹیکسلا کے بجائے دفتر چلا گیا، سہ پہر کو دو بجے کے بعد جب میں ہوٹل پہنچا تو کانفرنس

افتتاح کی تیاریاں ہو رہی تھیں، نماز اور کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے تین بج گئے، تمام مندوبین اپنے اپنے کمروں سے نیچے اتر کر لاؤنج میں جمع ہو رہے تھے، ہوٹل کے باہر وسیع لان میں خوبصورت شامیانوں کے نیچے افتتاح کی تقریب ہونے والی تھی، اصل پروگرام کے مطابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کو اس تقریب کا افتتاح کرنا تھا، لیکن علالت طبع کی بنا پر ان کی جگہ قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب عبدالجبار خاں صاحب افتتاح کے لئے تشریف لا رہے تھے۔

ہوٹل کے دروازے پر مرکزی وزیر قانون سید محمد ظفر صاحب شیروانی اور شلوار میں ملبوس مندوبین کو خوش آمدید کہہ رہے تھے تمام مندوبین کو یہیں جمع ہو کر جلوس کی شکل میں جلسہ گاہ تک پہنچنا تھا۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اپنی علالت طبع کی بنا پر اجتماع راولپنڈی نہیں پہنچ سکے تھے، اور آج سوا چار بجے کے طیارے سے تشریف لا رہے تھے، اس لئے میں ایئرپورٹ چلا گیا اور جب حضرت والد صاحب کے ساتھ واپس آیا تو افتتاح کی رسمی تقریب ختم ہو چکی تھی، محب محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ الحق کی زبانی معلوم ہوا کہ اس تقریب میں مختلف اسلامی ممالک کے سربراہوں کے پیغامات سنائے گئے، وزیر قانون جناب سید محمد ظفر صاحب نے خطبہ استقبالیہ دیا۔ صدر مملکت کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا، اور قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب عبدالجبار خاں صاحب نے تقریر کی۔

پہلا اجلاس

نماز مغرب کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس ...... ہوٹل کے ہال میں شروع ہوا۔ اس ہال کے مغربی کنارے پر ایک پُرشکوہ اسٹیج بنایا گیا تھا جس کے اوپر ایک مخملیں بینر پر موٹے موٹے حروف میں "انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤ" لکھا ہوا تھا، مشرقی جانب میں مندوبین کی کرسیاں ہال کے آخری سرے تک بچھی ہوئی تھیں جن پر تقریباً تین سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی، جونہی اجلاس شروع ہوا تمام کرسیاں پُر ہو گئیں، اور بہت سے لوگ نہ صرف ہال کے اندر بلکہ باہر کاریڈور میں بھی کھڑے رہے۔ آج کے اجلاس کا موضوع تھا "اسلام میں عقل کا کردار" مفتی اعظم فلسطین الحاج محمد امین الحسینی صدارت کر رہے تھے، اور جسٹس ایس۔ اے رحمان، پاکستان اور جناب ڈاکٹر حسین نصر (ایران) شریک صدر تھے، پڑھے جانے والے مقالوں پر تنقید کرنے کے لئے خود منتظمین کی طرف سے کچھ افراد نامزد کر دیئے گئے تھے، چنانچہ آج کے ناقد پروفیسر ایس۔ ایم یوسف (کراچی یونیورسٹی) اور جناب ابوالہاشم (ڈھاکہ) تھے۔

عقل جزئی

مقالوں کا آغاز ایران کے نوجوان مندوب ڈاکٹر حسین نصر نے کیا، انہوں نے اپنے انگریزی مقالے کی ابتدا بسم اللہ اور پستعین کے بعد ان الفاظ کے ساتھ کی۔

> "اس وقت اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں خطرناک ترین رجحان یہ ہے کہ بہت سے لوگ مغرب کے مقبول عام نظریات کو جوں کے توں لیکر ان کے ساتھ "اسلامی" کا لاحقہ لگا دیتے ہیں "اسلامی جمہوریت"، "اسلامی سوشلزم" اور "اسلامی عقلیت" کی اصطلاحیں اسی طرح وجود میں آئی ہیں، اور یہ درحقیقت اسلام کے ساتھ نادان دوستی ہے۔"

انہوں نے تالیوں کی گونج میں اس "نادان دوستی" کے مہلک نقصانات پر روشنی ڈالی، اور فاضلانہ انداز میں "عقلیت پرستی" (Rationalism) اور معقولیت و ذہانت (Intelligence and Logic) کا فرق واضح کیا، انہوں نے کہا کہ اسلام ایک معقول مذہب ہے اور ذہانت سے کام لینے کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن مغرب کی نام نہاد عقلیت پرستی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے جو انسان کو نری عقل کا غلام اور عقل کو حق وصداقت کا واحد معیار بنانا چاہتی ہے اور اس کے مقابلہ میں وحی کی ابدی صداقتوں کا انکار کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی، یہ عقل "عقل سلیم" نہیں ہے، بلکہ وہ عقل

ق ہے جس کے بارے میں مولانا رومؒ نے کہا ہے کہ ؎

عقل جزوی عقل را بدنام کرد

ڈاکٹر حسین نصر کے مقالے پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ حاضرین کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کر رہے ہیں ان کے مقالے کو بیحد سراہا گیا اور اس کے مفکرانہ مضامین اور موثر انداز بیان نے حاضرین کے دل موہ لئے۔

اس کے بعد سوڈان کی ام درمان یونیورسٹی کے پروفیسر ابوبکر الخلیفہ آئے تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ اسلام میں اجتہاد کی گنجائش ضرور ہے لیکن نصوص قرآن و سنت کے مقابلے میں اجتہاد کا کوئی مقام نہیں، اور اجتہاد کی اجازت صرف ان مسائل میں ہے جن میں قرآن و سنت کی کوئی صراحت موجود نہ ہو۔

اجتہاد اور قرآن و سنت

اس کے بعد کسی قدر حیل و حجت کے بعد جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی (پاکستان) ڈائس پر نظر آئے۔ ان کا لکھا ہوا مقالہ گم ہو گیا تھا اس لئے انھوں نے زبانی ہی اپنے خیالات پیش کئے۔ وہ انسانی عقل کی برتری کو ثابت کرتے ہوئے اجتہاد کے موضوع پر آگئے۔ اور اجتہاد کی اجازت کو عام کرتے ہوئے فرمایا کہ

"نصوص قرآن و سنت کے مقابلے میں بھی اجتہاد کی گنجائش ہے"

پھر انھوں نے علماء دین پر غیر سنجیدہ انداز میں طعن و تشنیع شروع کر دی کہ

"انھوں نے اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے ہیں حالانکہ سود وغیرہ کے معاملات میں آج اجتہاد کی شدید ضرورت ہے"

غرض انھوں نے فرمایا کہ

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت سے فیصلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کئے تھے، اور جب وہ آپؐ کے خلاف فیصلے کر سکتے ہیں تو ہم ان کے خلاف فیصلے کیوں نہیں کر سکتے؟"

احتجاج

اس جملے پر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دامت برکاتہم سے نہ رہا گیا وہ اپنی نشست سے اٹھے، اور بلند آواز میں مفتی اعظم فلسطین سے خطاب کرتے ہوئے کہا

"جناب صدر! مقرر کو اس گستاخی سے منع فرمایئے
وہ حضرت عمرؓ کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟"

حضرت مولانا مدظلہم کے اس ارشاد پر مجمع میں سے بہت سی آوازیں ان کی تائید میں بلند ہوئیں، لوگوں نے اٹھ اٹھ کر احتجاج شروع کر دیا اور تھوڑی دیر کے لئے مقرر کا تسلسل ٹوٹ گیا، اس پر مفتی اعظم فلسطین نے فرمایا۔

"مقرر کی تقریر پوری ہو جانے دیجئے، پھر جو صاحب اس پر تنقید کرنا چاہیں وہ اپنے نام اسٹیج پر بھیج دیں۔ بعد میں تنقید کا موقع دیا جائے گا"

اس اعلان پر مجمع پرسکون ہو گیا۔ اور تین مندوبین نے تنقید کے لئے اپنے نام بھجوا دیئے۔ جناب ڈاکٹر حب اللہ صاحب (متحدہ عرب جمہوریہ) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری (کراچی) اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب (ملتان) —— اس کے بعد جناب جعفر شاہ صاحب نے چند جملے مزید ارشاد فرمانے کے بعد تقریر ختم کر دی۔

اس کے بعد جناب مسعود انصاری نے سائنس اور اسلام کے موضوع پر ایک مختصر مقالہ پڑھا۔

تنقیدیں

اب مجلس کے مقررہ ناقدین میں سے جامعہ کراچی کے جناب ڈاکٹر محمد یوسف صاحب ڈائس پر آئے، اور انھوں نے بڑے معتدل اور سلجھے انداز میں اجتہاد کے بارے میں اپنی رائے پیش کی، انھوں نے کہا کہ عقل خالص کے استعمال کا صحیح موقع اسلام کو قبول کرنے سے قبل ہے، لیکن جب کوئی شخص اسلام کو مطابق عقل پاکر اسلام قبول کرلے تو اب اصل چیز اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بن جاتی ہے۔ اور عقل اس کے تابع ہے، اس کے باوجود اسلام میں اجتہاد کا دروازہ خاص شرائط کے ساتھ کھلا رکھا گیا ہے، لیکن یہ دروازہ ان لوگوں کیلئے قطعی طور پر بند ہے جو دین کے اجماعی مسلمات پر دست درازی کریں گے

نے کپڑے اتار کر اس دروازے میں داخل ہونا چاہتے ہوں۔

ان کے اس آخری جملے پر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ان کے بعد مشرقی پاکستان کے مسٹر ابوالہاشم صاحب نے انگریزی میں فی البدیہہ تقریر کی۔ اور عام تاثرات کے برخلاف خاصے متوازن خیالات پیش کئے۔ انہوں نے کہا کہ

> اسلام میں اجتہاد کی بلاشبہ اجازت دی گئی ہے۔ لیکن اس کے کچھ اصول وضوابط اور شرائط وآداب ہیں جنکا لحاظ رکھے بغیر اسلام کے تقاضوں کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

اب ان ناقدین کی باری تھی جنھوں نے اپنے نام بھجوائے تھے۔ سب سے پہلے جامعۃ الازہر متحدہ عرب جمہوریہ کے رئیس مجمع البحوث الاسلامیہ ڈاکٹر محمود فتح اللہ حب اللہ جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی کے مقالے پر تنقید کرنے کے لئے آئے، انھوں نے نہایت سنجیدہ اور متین انداز میں جعفر شاہ صاحب کے خیالات کا عالمانہ انداز میں جواب دیا۔ جن احادیث سے انھوں نے استدلال کرنے کی کوشش کی تھی ان کے معانی اور اسناد پر تبصرہ کیا، اور آخر میں کہا کہ

> اجتہاد کا مقام قرآن وسنت کی صراحتوں کے بعد آتا ہے، اور اس کے بھی کچھ حدود اور شرائط ہیں، اجتہاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "عقل انسانی" کو مادر پدر آزاد کرکے قرآن وسنت کو اس کے تابع بنا دیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن مسائل میں قرآن وسنت کی کوئی تصریح نہیں ملتی، ان میں قرآن وسنت ہی کے بیان کردہ اصولوں سے اس طرح احکام مستنبط کئے جائیں کہ اس سے دین کی بنیادی اقدار مجروح نہ ہونے پائیں"

ڈاکٹر حب اللہ کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہم اسٹیج پر تشریف لائے، موصوف نے "اجتہاد" کے موضوع پر ایک فاضلانہ مقالہ تحریر فرمایا تھا، لیکن چونکہ آپ کانفرنس شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے عمرہ کے سفر سے واپس تشریف لائے تھے، اس لئے مقررہ وقت میں اسے کانفرنس کے منتظمین تک نہ پہنچا سکے تھے۔ بنا بریں وہ مقالہ مجلس میں پڑھا نہ جا سکا، البتہ اس کی سائیکلو اسٹائل شدہ کاپیاں مندوبین میں تقسیم کردی گئیں۔ اس وقت مولانا نے اس مقالہ کا خلاصہ زبانی بیان فرماتے ہوئے "اجتہاد" کی حجیت اور اس کے شرائط و آداب کو مختصراً واضح فرمایا، اور موجودہ دور میں اجتہاد کے اصول وقواعد بیان فرمائے۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے بھی تنقید کے لئے اپنا نام بھجوایا تھا، لیکن اب تک مسئلے کی اس قدر بھرپور اور جامع توضیح ہوچکی تھی کہ انھوں نے مزید گفتگو کی ضرورت نہ دیکھتے ہوئے اپنا نام واپس لے لیا۔ اور اس طرح کانفرنس کا پہلا کھلا اجلاس ختم ہوگیا۔

۱۱ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

آج کے کھلے اجلاس کا موضوع تھا: "امن عالم میں اسلام کا حصہ" تاشقند کے مفتی ضیاء الدین بابا خانوف صدر محفل تھے۔ اور شام کے شیخ احمد کفتارو اور مشرقی پاکستان کے جسٹس سید محبوب مرشد شریک صدر کی حیثیت سے ان کے دائیں اور بائیں بازو پر بیٹھے ہوئے تھے، پاکستان کے پروفیسر ابوبکر حلیم اور خواجہ سرور حسن صاحب کو ناقد مقرر کیا گیا تھا۔ اجلاس کا موضوع بہت سادہ سا تھا، کوئی بحث طلب بات نہ تھی، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا تھا کہ ؎

مزدکی ہو کہ فرنگی، ہوس خام میں ہے
امن عالم تو فقط دامن اسلام میں ہے

اس لئے ناقد حضرات کو کسی تنقید کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

مفتی اعظم فلسطین، مراکش کے عبدالرحمن الدکالی، شام کے شیخ احمد کفتارو، ملائشیا کے ڈاکٹر ایس۔ اے حسن، سعودی عرب کے شیخ حسن کتبی اور پاکستان کے پیر صاحب دیول شریف اور بریگیڈیر گلزار احمد صاحب نے مقالے پڑھے، بعض مقررین نے

نظریۂ قومیت کی بھی تردید کی۔ اور ایک بجے کے بعد یہ اجلاس بھی برخاست ہوگیا۔

آج دو بجے کے بعد سے بند کمروں میں جلسہ ہائے مضامین کے اجلاسات بھی شروع ہونے تھے۔ اس پروگرام کے لئے تین کمیٹیاں بنائی گئی تھیں، پہلی کمیٹی عائلی قوانین کے مسائل پر غور کرنے کے لئے بنائی گئی تھی اور اس میں مندرجۂ ذیل حضرات شامل ہوئے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب (ملتان) علامہ علاؤالدین صدیقی، حضرت مولانا راغب احسن صاحب (مشرقی پاکستان)، حضرت مولانا مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد پروفیسر نشاط چغتائی (ترکی) جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب، جناب محمد مسعود صاحب (ناظم اعلیٰ اوقاف مغربی پاکستان) جناب کرم شاہ صاحب (مشرقی پاکستان) اور جناب ابوالہاشم صاحب (مشرقی پاکستان)

مولانا غلام مرشد صاحب کو اس کمیٹی کا چیرمین بنایا گیا تھا۔

دوسری کمیٹی "بنیادی انسانی حقوق و فرائض" سے متعلق تھی جسٹس سید محبوب مرشد اس کے چیرمین تھے۔ اور مندرجہ ذیل حضرات ارکان پروفیسر ذکی ولیدی طوغان (ترکی)، پروفیسر ایس بی اے علیم (پاکستان)، شیخ منصور المحجوب (لیبیا)، شیخ حسن کتبی (سعودی عرب) ڈاکٹر حسین نصر (ایران)، شیخ عبدالرحمن الدکالی (مراکش)، مسٹر عمر فروخ (لبنان) اور ڈاکٹر سراج الحق (پاکستان)

تیسری کمیٹی کا موضوع "بنکاری اور بیمہ" تھا، اس کے چیرمین جناب ممتاز حسن صاحب تھے اور حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی (پاکستان) جناب یعقوب شاہ صاحب (پاکستان) شیخ احمد کفتارو (شام)، ڈاکٹر جواد علی (عراق)، مسٹر کمال التارزی (تیونس) پروفیسر ابوبکر الخلیفہ (سوڈان) مسٹر ایس اے حسن (ملائیشیا)، ڈاکٹر [illegible] (متحدہ عرب جمہوریہ) اور جناب عبدالقدوس صاحب وغیرہ اس کے ممبر تھے

میں سرگرداں پائے گئے۔ باقی دو کمیٹیاں شام پانچ بجے تک بحث کرتی رہیں، ان کا فیصلہ کن اجلاس کل ہی ہوسکے گا۔

اسلام آباد میں

شام کے وقت مندوبین کو اسلام آباد دکھانے کا پروگرام تھا، چنانچہ پانچ بجے سے کچھ پہلے پورا قافلہ ہوٹل سے روانہ ہوا اور تقریباً نصف گھنٹے کے دلچسپ سفر کے بعد اسلام آباد پہنچ گیا۔ پاکستان کا یہ نوزائیدہ دارالحکومت ہمالیہ کی گود میں بڑے قرینے سے پروان چڑھ رہا ہے، اور انشاء اللہ اپنے عہد شباب میں دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں سے ہوگا، اس علاقے کو قدرت نے صحت افزا آب وہوا اور فطری مناظر سے مالامال کیا ہے، مشرق میں ہمالیہ کی قدرتی فصیلیں اس کے حسن اور شکوہ میں بے پناہ اضافہ کرتی ہیں اور جنوب میں راول بند کی تعمیر نے اس کی شادابی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ یہاں پہنچکر مجھے بے ساختہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یاد آگئی۔

رب اجعل ھذا البلد امنا واجنبنی وبنی أن نعبد الأصنام۔

میرے پروردگار! اس شہر کو پُرامن بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ

میں دعا کرتا رہا کہ خدا کرے یہ شہر صحیح معنوں میں "اسلام آباد" بنے، اور پتھر کے بتوں کے علاوہ باطل نظریات، خواہشات نفس اور ہر قسم کے بتوں کی پرستش سے محفوظ رہے، آمین!

اسلام آباد پہنچکر ہم نے سب سے پہلے ہوٹل شہرزاد کے لان میں نماز عصر ادا کی، نماز کے بعد ایک ذمہ دار آفیسر نے اسلام آباد کا نقشہ سمجھایا، مغرب سے ذرا پہلے ہم سیکرٹریٹ پہنچے، جو اس وقت اسلام آباد کی حسین ترین عمارت ہے، اور بلاشبہ نہایت خوش ذوقی سے بنائی گئی ہے۔ نماز مغرب جامع مسجد میں ادا کی، نماز کے بعد تیونس کے جناب کمال التارزی نے جشن نزول قرآن کے موضوع پر تقریر کی اور کہا کہ

"اس جشن کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کچھ پہلے اور

اجتماعات منعقد کر کے فارغ ہو جائیں، بلکہ اس جشن کا تقاضا یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ اس نے قرآن کریم کو کس حد تک اپنی زندگی میں اپنایا ہے، اس کی کتنی تعلیمات پر عمل کیا ہے۔ اور کتنی ہدایات سے روگردانی کی ہے۔

ہمارے پاکستانی عوام عملی اعتبار سے خواہ کسی مقام پر ہوں لیکن اسلام کی محبت ان کی رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔ مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک کے مسلمانوں کو یکجا دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے، چنانچہ آج بھی ان کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ وہ اپنے مہمانوں کی زبان سے ناواقف تھے لیکن محبت زبان و بیان کی محتاج نہیں ہوتی، ان کے دمکتے ہوئے چہروں کی مسکراہٹ اپنے بھائیوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ اور ان کی محبت بھری نگاہوں سے اپنائیت کا دلنواز پیغام سنائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ جامع مسجد سے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ گیا اور اس کے دفاتر اور کتب خانے کا معائنہ کرنے کے بعد راولپنڈی واپس آگیا۔

۱۲ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

آج کے اجلاس کا موضوع تھا: "اسلام کا عادلانہ نظام" جامعۃ الازہر کے مدیر باقوری صدر محفل تھے اور ترکی کے ڈاکٹر زکی ولیدی طوغان اور اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی شریک صدر کی حیثیت سے ان کے پہلو میں بیٹھے تھے، تلاوت کلام پاک کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر زکی ولیدی طوغان نے اپنا مقالہ پڑھا، ان کے پڑھنے کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ کافی دیر کے بعد ہمیں علم ہو سکا کہ یہ انگریزی میں پڑھا جا رہا ہے۔ اور اس کے بعد ابھی ہم مقالے کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ وہ ختم ہو گیا۔

تقسیم دولت

اس کے بعد میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ڈائس پر تشریف لائے ان کے مقالے کا عنوان تھا: "اسلام کا نظام تقسیم دولت"

اس مقالے میں سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام کے نظریۂ تقسیم دولت کا خالص فنی انداز میں موازنہ کیا گیا تھا، اور اس ضمن میں اسلامی تعلیمات کو ایک بالکل اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہوئے سود کی حرمت، مسئلہ ملکیت اور آجر و اجیر کے تعلقات کی اسلامی نوعیت کو واضح کیا گیا تھا۔ مقالہ تقریباً نصف ہوا ہو گا کہ ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے وقت کی تنگی کے پیش نظر مقالہ کو مختصر کرنے کی فرمائش کی لیکن سامعین نے جو مقالے کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے ——— بلند آواز کے ساتھ صاحب صدر سے درخواست کی کہ "مقالہ پورا سنایا جائے" چنانچہ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اپنا مقالہ پورا ہی سنایا۔ مقالے کے دوران بار بار تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ اور جس وقت حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے انفرادی ملکیت کے بارے میں اسلام کی روش بیان فرمائی اور حرمت سود کے معاشی دلائل بیان کئے تو ہر موقعہ پر ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔

مقالہ اگرچہ اردو میں تھا، لیکن عرب مہمان جا بجا قرآن کریم کی آیتوں اور اردو میں استعمال ہونے والے عربی الفاظ کی مدد سے اس کا مفہوم کسی قدر سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم جب مقالہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو صدر محفل "مدیر الازہر جناب باقوری" نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"واللہ، علمہٗ غزیر!"

اس کے فوراً بعد چائے کا وقفہ ہو گیا، اس وقفے میں عام موضوع گفتگو یہی مقالہ تھا، اور میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ اس مقالے نے حاضرین محفل پر غیر معمولی تأثر چھوڑا ہے، اجلاس کا دوسرا دور شروع ہوا تو میں نے حضرت والد صاحب مدظلہم کی علالت اور ضعف کے پیش نظر ان سے درخواست کی کہ اب وہ کمرے میں تشریف لیجائیں تاکہ دو بجے کی مجلس سے پہلے کچھ آرام کا موقع مل جائے چنانچہ وہ اس کے بعد کمرے میں تشریف لے گئے۔

میں محب محترم مولانا سمیع الحق صاحب (مدیر الحق) کے ہمراہ جب دوبارہ کانفرنس ہال میں داخل ہوا تو کویت کا ایک

وزیر جناب رفاعی تقریر کر رہے تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں ایک بین الاسلامی ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی جو اسلامی ممالک کے درمیان علمی، معاشرتی اور اقتصادی تعاون کو فروغ دے سکے۔

انفرادی ملکیت

ان کی تقریر ختم ہوئی تو مغربی پاکستان میں محکمۂ اوقاف کے ناظم اعلیٰ جناب محمد مسعود صاحب نے اپنا مقالہ پڑھنا شروع کیا۔ میں اس عجیب "اتفاق" پر حیران تھا کہ اردو کے وہ سرگرم پرستار جو نماز تک اردو میں پڑھنے کے قائل ہیں، اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھ رہے تھے، پھر مقالہ کا مرکزی خیال تو یہ تھا کہ اسلام میں انفرادی ملکیت ناجائز ہے، اور اسلام کی تعلیم (سوشلزم کی طرح) یہ ہے کہ تمام اراضی حکومت کی ملکیت ہوں؟ لیکن اس موضوع پر آنے سے قبل نہ جانے کس مصلحت سے انھوں نے علماء دین کو کچھ ملاحیاں سنانا ضروری سمجھا۔

یہ اندازِ گفتگو-؟!

چنانچہ اپنے مقالہ کی طویل تمہید میں انھوں نے علماء کے خلاف نہ صرف الفاظ، بلکہ لہجے اور دست و بازو کی حرکات سے بھی اپنے غیظ و غضب کا اظہار فرمایا۔ ان کے جذباتی — بلکہ کافی حد تک "تمثیلی" — اندازِ خطابت نے اس سنجیدہ علمی محفل کو بڑا "دلچسپ" بنا دیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ہال میں موجود افراد "سامعین" سے زیادہ "ناظرین" بن گئے۔

پھر جناب محمد مسعود صاحب نے انفرادی ملکیت کے خلاف قرآن کریم کی کچھ آیات سے استدلال کیا، اور اس کے بعد کچھ احادیث پیش کیں، اس گفتگو کے دوران وہ حضرت رافع بن خدیج رض کا نام بار بار "رَافِعَۃ بِنْ خُدَیْج" پڑھ رہے تھے۔ اور حضرت بلال حبشی رض کو "بُلال حبشی" فرما رہے تھے، اس پر حاضرین میں سے کسی صاحب نے بلند آواز سے کہا:

"جناب! صحابہ رض کا نام صحیح پڑھئے، یہ رافعہ نہیں رافع رض ہیں۔ اور بُلال رض نہیں، بِلال رض ہیں"

اس اعتراض پر موصوف کو شدت سے پیاس محسوس ہوئی اور انھوں نے منتظمین سے پانی کی فرمائش کی، ان کے پانی مانگنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ حاضرین سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور چند لمحوں کے لئے محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

پانی پی کر انھوں نے پھر مقالہ پڑھنا شروع کیا، ایک مقام پر پہنچ کر انھوں نے کہا کہ:

"اس موضوع پر میں نے اور بھی بہت سے دلائل دیئے تھے، مگر اختصار کے پیش نظر انھیں چھوڑ رہا ہوں"۔

اس پر مجمع سے ایک آواز بلند ہوئی:

"اس احسان پر ہم آپ کے شکر گذار ہیں"

مقالہ کے اختتام پر انھوں نے چیلنج دینے کے انداز میں ہاتھ بلند کیا، اور تین مرتبہ زور دے کر یہ الفاظ دہرائے کہ

"هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا؟"

(تمہارے پاس کچھ علم ہے؟ تو نکال کر لاؤ)

چیلنج دینے کی اس ادا پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ یہ کوئی علمی اور تحقیقی کانفرنس ہے یا بازاری مناظروں کا اکھاڑہ؟

ھنگامہ

اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے کھڑے ہو کر صدرِ محفل سے تنقید کی اجازت طلب کی، شریک صدر جناب رضی الدین صدیقی صاحب نے وقت کی تنگی کا عذر پیش کیا تو سامعین پکار اٹھے کہ اس مقالہ پر تنقید کا وقت ضرور ملنا چاہئے۔ بار بار کے اصرار پر صدر محفل جناب باقوری نے کہا کہ اگر حاضرین کی اکثریت تنقید کا مطالبہ کرتی ہے تو تنقید کا وقت دیدیا جائے گا۔ اس پر ہر طرف آوازیں اٹھنے لگیں کہ تنقید ضرور کرائی جائے۔ لیکن جناب رضی الدین صاحب صدیقی نے اس کے بعد تنقید کے بجائے یہ اعلان کر دیا کہ:

"جناب ممتاز حسن صاحب اپنا مقالہ پیش فرمائیں"

اس اعلان پر سامعین کا مطالبہ پہلے احتجاج اور چند لمحوں کے بعد اشتعال میں تبدیل ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

لوگ کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک مندوب تو کچھ زیادہ ہی برافروختہ ہوگئے۔ اور انھوں نے نشست سے اٹھ کر جناب محمد مسعود صاحب کے حق میں نہایت بامحاورہ اردو استعمال کرنی شروع کردی، ان کی آواز پورے ہال میں سب سے نمایاں تھی، انھیں وزیر قانون جناب ایس۔ ایم ظفر صاحب نے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا، لیکن اس عرصہ میں اجلاس کا نظم تقریباً درہم برہم ہوچکا تھا، بہت سے سامعین کرسیوں سے اٹھ کر اسٹیج کے قریب پہنچ چکے تھے، اور میرے لئے اسٹیج کا دیکھنا مشکل ہوگیا تھا۔

جب حالت قابو سے باہر ہونے لگی تو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اپنی نشست سے اٹھکر صدرِ محفل جناب باقوری کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ:

"ہنگامہ کی یہ صورت افسوسناک ہے، لیکن اگر تنقید کا موقع نہ دیا گیا تو سامعین اپنے اس احتجاج میں حق بجانب ہوں گے، اور اندیشہ ہے کہ صورت حال بالکل ہی نہ بگڑ جائے، آپ مجھے دس منٹ کے لئے اظہار خیال کا موقع دیں تو امید ہے کہ ہنگامہ فرو ہوجائے گا، بازاری انداز کا مناظرہ اور نزاع و جدال میرا مقصد نہیں ہے، میں صرف سنجیدہ علمی انداز میں اس مقالے پر تنقید کرنا چاہتا ہوں"۔

یہ بات جناب باقوری کی سمجھ میں آگئی اور انھوں نے تنقید کی اجازت دیدی، تھوڑی دیر کے بعد مفتی صاحب ڈائس پر نظر آئے تو مجمع پُرسکون ہونے لگا۔ اور تقریباً ایک منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

تنقید

حضرت مفتی صاحب نے نہایت سنجیدہ اور متین انداز میں جناب مسعود صاحب کے مقالہ پر تبصرہ کرنا شروع کیا تو سامعین میں سے ایک صاحب جو جناب مسعود صاحب کے خیالات کے حامی تھے، بیچ ہی میں کھڑے ہو کر کچھ فرمانے لگے۔ لیکن شاید وہ اس سے قبل مجمع کے سامنے بولنے کی نزاکتوں سے کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے کھڑے ہونے کے بعد ایک شدید آزمائش میں مبتلا ہوگئے، ابھی وہ اٹک اٹک کر چند بے ربط سے جملے کہہ پائے تھے کہ پیچھے بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے انھیں کچھ اس انداز میں بیٹھ جانے کا مشورہ دیا کہ انھوں نے اس مشورہ کو قبول کرنے میں مطلق دیر نہ کی۔ اور جلد ہی اس آزمائش سے آزاد ہوگئے۔

حضرت مفتی صاحب نے جناب محمد مسعود صاحب کے دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"انھوں نے جن آیات و احادیث کے حوالے دیئے ہیں، خود انہی میں جناب مسعود صاحب کے خیالات کی تردید موجود ہے، مثلاً انھوں نے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ سے انفرادی ملکیت کے خلاف استدلال کیا ہے، لیکن اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ اسی کے آگے یہ جملہ بھی ہے کہ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاءُ حضرت رافع رضی کی جو حدیث جناب مسعود صاحب نے پیش کی ہے خود اس میں زمین کو عطیہ کے طور پر کسی مسلمان بھائی کو دینے کا حکم ہے، اور ظاہر ہے کہ عطیہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ عطیہ دینے والا اس کا مالک رہا ہو۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کی حیثیت اور اس کے تفصیلی دلائل مجھ سے قبل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم اپنے مقالے میں بیان فرما چکے ہیں، لیکن موٹی سی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر انفرادی ملکیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو زکوٰۃ، عُشر، خراج، اور انفاق فی سبیل اللہ کے ان تمام احکام کا کیا مطلب رہ جاتا ہے جن سے قرآن و حدیث بھرے ہوئے ہیں؟"

مفتی صاحب کے جملے جملے پر لوگ مسرت و تائید کا اظہار کر رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ کی تقریر کے بعد مفتی صاحب تحسین و آفرین کی صداؤں میں رخصت ہوگئے۔

حضرت مفتی صاحب کی اس تقریر کے بعد جلسے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی دن شام کو تینوں کمیٹیوں کا آخری اجلاس ہوا لیکن کمیٹیوں کی کارروائی کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا۔

۱۳ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

آج اختتامی اجلاس تھا، مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات جناب خواجہ شہاب الدین صاحب صدارت کر رہے تھے، اور علامہ علاؤ الدین صاحب صدیقی اور جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب شریک صدر تھے، ابتدائی کارروائی کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے انگریزی میں کانفرنس کے تینوں اجلاسات کا خلاصہ پیش کیا اور اس قسم کے اجتماعات کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے بعد مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مندوبین نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا آخر میں ایران کے مندوب کی حیثیت سے ڈاکٹر حسین نصر صاحب تشریف لائے، اور چلتے چلتے وہ بڑی پتے کی باتیں کہہ گئے، کانفرنس کی مختلف تقریروں میں تبلیغ اسلام کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔

تبلیغ کس کو؟

انہوں نے کہا کہ غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کے ساتھ ہمیں اس بات پر بھی پوری اہمیت کے ساتھ غور کرنا چاہئے کہ ہم اپنے آپ کو کس طرح مسلمان بنائیں، ہماری حالت عرصہ دراز سے یہ ہوتی جا رہی ہے کہ ہم اپنی نشست و برخاست کے ہر طور طریقے میں غیر مسلموں کی ادائیں اختیار کرتے جا رہے ہیں، اور اسلامی آداب کو پس پشت ڈالا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال کو تبدیل کرنا ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے۔"

دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ

"عصر حاضر میں اسلامی احکام کی تحقیق کی بڑی ضرورت ہے، لیکن اس تحقیق کا رُخ صحیح اور خالصۃً اسلامی ہونا چاہئے، ورنہ اس سے کوئی حاصل نہیں کہ مقالہ کی ابتدا بسم اللہ سے ہو، الحمد للہ پر اختتام ہو اور بیچ میں ساری باتیں غیر اسلامی کہی جائیں۔"

خواجہ شہاب الدین صاحب

آخر میں مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات خواجہ شہاب الدین صاحب نے اپنا صدارتی مقالہ پڑھا، اس مقالے کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کا مغربی اطوار کو اپنا لینا (رقص و سرود کو اختیار کر لینا وغیرہ) نہیں ہے جیسا کہ عام طور سے بیان کیا جاتا ہے، بلکہ اس کا اصل سبب قرآن کریم میں تدبر و تفکر کا چھوڑ دینا ہے۔

(۲) قرآن کریم کی بنیادی دعوت یہ ہے کہ کائنات میں غور و فکر کیا جائے۔ اسی لئے قرآن کریم علماء ان لوگوں کو کہتا ہے جو صحیح فکر کے ساتھ سائنس کا علم حاصل کریں، انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤ میں علماء سے مراد یہی لوگ ہیں۔

(۳) مسلمانوں کے جمود کا ایک سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو تنقید سے بالاتر سمجھ رکھا ہے، حالانکہ یہ وہ تاریخ ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ تک کو داغدار بنا دیا ہے۔

(۴) لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ سائنس کی تعلیم کو اپنے نظام تعلیم میں سب سے مقدم رکھیں، اور طلباء میں اس انداز سے اسلامی فکر پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ وہ اپنے تدبر کو دین کیلئے استعمال

(۵) نیز جو روایات ہمارے معاشرے میں پھیل گئی ہیں ان پر تنقیدی نظر ڈالکر ان کی اور مروجہ فقہ کی اس طرح نئی تدوین کریں کہ وہ نئے تقاضوں کے مطابق ہو۔

اس مقالے نے کانفرنس کو ایک افسوسناک صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ اول تو اختتامی اجلاس اس قسم کے مسائل چھیڑنے کیلئے موزوں نہیں تھا جو بحث کو دعوت دینے والے ہوں، چنانچہ آج کے دن پروگرام میں بھی کوئی اس قسم کا موضوع نہیں رکھا گیا تھا، پھر اگر ان نظریات کا اظہار آج ہی کے دن ضروری تھا تو چونکہ مقالے کی بہت سی باتیں امتِ اسلامیہ کے عام مسلمات کے خلاف تھیں اس لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ جس صاف گوئی کے ساتھ ان نظریات

بیان کیا گیا تھا، اتنے ہی کھلے دل کے ساتھ اس پر دوسرے حضرات کے نقطۂ نظر کو بھی سنا اور سمجھا جاتا، ظاہر ہے کہ کانفرنس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ مختلف خیالات رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو دور دور سے سننے کے بجائے قریب سے سمجھنے کی کوشش کریں، لہٰذا ضروری تھا کہ خواجہ صاحب اپنا مقالہ سنانے کے بعد مجلس میں تشریف رکھتے اور دوسروں کو بھی اظہارِ خیال کا موقعہ دیتے جیسا کہ اس سے پہلے اجلاسات میں یہی معمول رہا خاص طور سے جبکہ انھوں نے مقالے ہی میں یہ بات صاف کر دی تھی کہ وہ یہ تمام باتیں اپنی ذاتی حیثیت میں فرما رہے ہیں، اور ان کو سرکاری حیثیت میں نہ سمجھا جائے۔

ھنگامہ لیکن ہوا یہ کہ جب حاضرین کو تنقید کا باقاعدہ موقعہ نہ مل سکا تو انھوں نے کھڑے ہو کر مقالے پر کچھ اعتراضات کئے، اور خواجہ صاحب اس کے بعد جلد ہی کانفرنس سے تشریف لے گئے۔ اس کا نتیجہ ایک شدید ہنگامے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حاضرین نے اپنی نشستوں سے اٹھ کر بآوازِ بلند مقالے پر احتجاج شروع کر دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے جلسے کا نظام بالکل درہم برہم ہو گیا، اور کانفرنس کا آخری اجلاس جسے نہایت خوشگوار فضا میں ختم ہونا چاہئے تھا، ایک افسوس ناک ہنگامے پر ختم ہوا۔ اس صورتِ حال کا جو اثر غیر ملکی مندوبین پر ہوا وہ ظاہر ہے، بعض غیر ملکی مندوبین تو خواجہ صاحب کے مقالے پر نہایت مشتعل پائے گئے۔

قادیانی تبلیغ اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جسے آخر میں سنا دینے کو جی چاہتا ہے جتنے دن غیر ملکی مندوبین راولپنڈی میں مقیم رہے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل قادیانی صاحبان کی تگ و دو کا محور بنا رہا۔ مگر چونکہ بیشتر غیر ملکی مہمان قادیانی دین کی حقیقت سے واقف تھے۔ اس لئے ان کی طرف سے کسی غلط فہمی کا خطرہ نہیں تھا، آج تاشقند کے مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کے نوجوان سیکریٹری مجھ سے ملے تو پوچھنے لگے کہ: "یہ احمدی کون لوگ ہیں؟" میں نے مختصراً ان سے قادیانیوں کا تعارف کرایا تو وہ کہنے لگے۔

"پرسوں میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا"

میں نے تفصیل پوچھی تو انھوں نے کہا:

"پرسوں شام کو میں ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ ایک صاحب جو روانی کے ساتھ عربی بول رہے تھے۔ میرے پاس آبیٹھے، اور مجھ سے تعارف پیدا کرنے کے بعد پوچھنے لگے کہ: "اس وقت آپ کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے ان سے کہا کہ "میں ذرا شہر دیکھنے کے لئے باہر جانا چاہتا ہوں" اس پر انھوں نے اپنی کار کی پیش کش کی اور پرانے شہر میں ایک جگہ جا کر گاڑی روک دی، میں نے ان کو پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے؟ تو وہ جواب دینے کے بجائے مجھے اترنے کا اشارہ کر کے ایک عمارت میں لے گئے، جہاں کچھ لوگ حلقۂ درس کی شکل میں بیٹھے تھے، وہاں لیجا کر انھوں نے مجھے کتابیں دکھائیں، لوگوں سے ملایا۔ اور بتلایا کہ یہ ایک مدرسہ ہے جہاں دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ میں نے ان سے یہاں ٹھیرنے کے بجائے شہر میں گھومنے کی بار بار خواہش ظاہر کی تو وہ ہر مرتبہ ٹال گئے، اور مجھے کافی دیر تک وہیں بٹھلائے رکھا، اسی اثناء میں وہ ایک رجسٹر لیکر آئے اور مجھ سے اس پر مدرسہ کے معائنہ کے تاثرات لکھنے کی فرمائش کی۔ میں ان کے پراسرار اور فریب آمیز انداز سے کھٹک چکا تھا اس لئے چند مبہم سے جملے لکھ دیئے، اس کے بعد وہ مجھے بہت سی کتابیں دے کر واپس ہوٹل لے آئے یہاں پہنچ کر میں نے کتابیں دیکھیں تو اس میں "جماعت احمدیہ" کا ذکر تھا، میں نے مفتی بابا خانوف سے اس جماعت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ:

"یہ قادیانی مذہب کا دوسرا نام ہے، یہ لوگ مسلمان نہیں اور ایک جھوٹے نبی کو نبی یا مسیح مانتے ہیں، تمہیں ان کے ساتھ نہ جانا چاہیے تھا"

"اگلے دن شام کو میں پھر لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ وہی صاحب پھر آئے اور کہنے لگے: "میرے ساتھ چلئے!"

مجھے ان کے کل کے طرزِ عمل پر سخت طیش تھا، میں نے تلخ لہجے میں ان سے کہہ دیا کہ:

"اب میں قیامت کے روز ہی آپ کے ساتھ جا سکوں گا اور جب تک آپ کو آپ کے ٹھکانے تک نہ پہنچا دوں، آپ کا ساتھ نہیں چھوڑونگا"

اسرار صاحب نے یہ آخری جملہ کچھ ایسی معصومیت سے کہا کہ میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

وہیں لطفِ داستاں ہے

رات کو قرآن کونسل کی طرف سے اسلام آباد کے ہوٹل شہرزاد میں ایک عشائیہ دیا گیا تھا، کھانے سے پہلے کویت کے مندوب جناب رفاعی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جشن نزولِ قرآن کو محض رسمی تقریبات پر ختم کر دینا قرآن کریم پر ظلم کے مرادف ہوگا، اس لئے ہمیں بلا تاخیر گفتار سے کردار کی طرف قدم بڑھانا چاہیے، اس کے بعد انھوں نے تجویز پیش کی کہ قرآن کریم کو حفظ کرانے اور اس کے الفاظ و معانی کی تعلیم کے لئے ایک ہمہ گیر تحریک چلائی جائے، تاکہ اس جشن کا کوئی عملی فائدہ سامنے آسکے۔

ان کے بعد ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب تشریف لائے، اور انھوں نے تقریباً ۴۰ منٹ کی تقریر میں بڑے فاضلانہ انداز میں قرآن فہمی کے بنیادی اصول بیان کئے۔ سنت کی حجیت کو ثابت کیا۔ اور تفسیر قرآن کے آداب و شرائط کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تفسیر بالرائے کی خرابیاں گنوائیں۔ اور اس چلے ہوئے نعرے کی تردید کی کہ "تفسیر قرآن کے لئے عالم دین ہونے کی شرط لگانا' دین پر علماء کی اجارہ داری قائم کر دینا ہے"

تقریر کے دوران اچانک میری نظر اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے بعض "اسلامی محققین" پر پڑی تو دیکھا کہ انھوں نے اپنی نظریں جھکائی ہوئی ہیں، اور نہ جانے کیوں میرے ذہن میں بیاختہ یہ شعر رقص کر گیا کہ ؎

مراقصۂ شبِ غم ہو بیاں تو سنئے سنئے
وہ جہاں نظر جھکا دیں وہیں لطفِ داستاں ہے

(بقیہ مضمون "خواتین اسلام") علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے بھی گناہ ہیں ان میں سے اللہ تعالیٰ جنکو چاہتا ہے معاف فرما دیتا ہے لیکن ماں باپ کے ستانے کا جو گناہ ہو اس کی سزا موت سے پہلے دنیا ہی میں دیدیتا ہے (شعب الایمان) —— ایک شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں اور آپ سے مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں؟ آپ نے دریافت فرمایا کیا تیری والدہ زندہ ہے؟ عرض کیا جی ہاں زندہ ہے! فرمایا جا اس کی خدمت میں لگا رہ کیونکہ جنت اس کے پاؤں کے قریب ہے (نسائی، بیہقی) حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے سوال کیا یا رسول اللہ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا وہ دونوں تیرے لئے جنت اور دوزخ ہیں (ابن ماجہ) مطلب یہ ہے کہ ماں باپ کو خوش کروگے تو وہ تمہارے لئے جنت کا ذریعہ بنیں گے ان کی خوشنودی خدائے پاک کی خوشنودی کا باعث ہے، اللہ بھی مہربان ہوگا اور وہ بھی دعا کریں گے، اور اگر تم نے ان کو ناخوش رکھا، بُرے برتاؤ سے پیش آئے ان کا دل دکھایا، خرچ کی تنگی میں ان کی مدد نہ کی تو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے اور ان کے دکھے ہوئے دل سے بددعا نکلے گی جو دوزخ میں داخل ہونے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جن کے والدین یا دونوں میں سے ایک زندہ ہو تو ان کی خدمت کرے اور جن کے والدین فوت ہو چکے ہوں اگر زندگی میں ان کو تکلیف پہنچائی تھی تو اس کی تلافی کی یہ صورت ہے کہ ان کے لئے برابر دعا اور استغفار کرتے رہیں اس طرح اللہ تعالیٰ حسن سلوک کرنیوالوں میں ......

مولانا عبدالشکور لکھنوی اور ان کے چند مکتوبات

جناب محمد ایوب قادری ایم۔اے

مولانا عبدالشکور بن مولوی حافظ ناظر علی ۳ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد، مولوی حافظ عبدالسلام ہنسوی (ف ۱۲۹۹ھ) کے مرید و خلیفہ تھے، جن کو شاہ احمد سعید مجددی (ف ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) سے خلافت حاصل تھی۔ مولانا عبدالشکور نے ابتدائی تعلیم اور فارسی کی تحصیل مولوی عبدالوہاب ہنسوی اور مولوی مظہر حسین ساکن کوٹرا جہان آباد سے کی۔ اس کے بعد عربی کی تعلیم نورالانوار تک ہنسوہ میں مختلف اساتذہ سے حاصل کی پھر مولانا عین القضاۃ لکھنوی (ف ۱۳۴۳ھ) کی خدمت میں پہنچے اور بقیہ کتب درسیہ اور بعض دوسری کتابیں مثلاً بست باب اصطرلاب وغیرہ پڑھیں۔ انھوں نے مولانا عین القضاۃ کے یہاں ۱۳۱۱ھ سے ۱۳۱۴ھ تک تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالشکور بھوپال کے مشہور نقشبندی بزرگ شاہ ابواحمدؒ[1] سے بیعت تھے۔

کچھ مدت مولانا نے ندوۃ العلماء میں درس دیا، پھر دہلی چلے گئے۔ اور مرزا حیرت دہلوی (ف ۴ مارچ ۱۹۲۸ء) کے یہاں بحیثیت مترجم و مصنف کام کیا۔ مولانا متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں ترجمہ قرآن کریم، ترجمہ ازالۃ الخفاء، ترجمہ الانصاف، علم الفقہ، سیرت خیرالبشر، خلفائے راشدین وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ مولانا نے رد شیعیت میں بڑا کام کیا ہے۔ ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالشکور کے آٹھ خط ہمیں بہم دست ہوئے۔ جن میں پہلے چھ خط منشی حلیم الدین صاحب ساکن بجھارہ نزیل بھوپال کے نام ہیں اور خط مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے نام ہے۔ ایک خط عام مخاطب کے نام ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے نام جو خط ہے وہ بعض علمی فوائد پر مشتمل ہے اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چھ خط ڈاکٹر محمد سلیم پرنسپل شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ سے اور دو خط مولانا لکھنوی کے خلف الصدق مولوی حکیم محمد عبدالغنی فاروقی سے دستیاب ہوئے۔

احسن الکتاب وصفات الانساب تالیف ۱۲۹۵ھ (قلمی) مؤلفہ عبدالرحیم ساکن اترولی، محمد ایوب صاحب قادری کی فراہم کردہ میں نے یہ دیکھی۔ یہ کتاب ہماری برادری قانون گویاں کے حالات

---

[1] ابواحمد خلیب احمد بن شاہ رؤف احمد مجددی رامپوری ۱۲۶۵ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالغنی مجددی سے مدینہ منورہ میں بیعت ہوئے۔ اور چند برس حضرت کی خدمت میں رہے۔ سنت کے بہت پابند تھے تمام وقت ریاضت و عبادت میں صرف کرتے تھے ساری زندگی توکل و استغنا سے بسر کی۔ ۱۰ جمادی الاول ۱۳۴۱ھ کو انتقال ہوا۔ "امام مروج الشریعت" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ان کے خلف الصدق حاجی شاہ محمد یعقوب ان کے جانشین ہوئے۔

(ذکر طیب مرتبہ مولانا عبدالشکور لکھنوی۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۳۴۶ھ)

ورنسب ناموں کے سلسلے میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں خاندان
قانون گویان باپوڑ کا بیان بھی ہے جو اس کتاب کے صفحہ ۱۹۷ تا
۲۰۲ پر مبسوط ہے۔ یہی ہمارا خاندان ہے۔ مصنف باوجودیکہ خود
دریافت حال کے لئے باپوڑ گیا مگر ہمارے والد شیخ علی حسین صاحب
مرحوم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بشارت علی ولد نور علی جن سے مصنف نے معلومات
حاصل کی ہیں وہ ہمارے ہی خاندان کے بزرگ ہیں اسی طرح غلام حسین
و سلطان بخش اور جمال علی و قادر علی وغیرہ بھی ہمارے خاندان کے لوگ
ہیں، چونکہ والد صاحب مرحوم بسلسلہ ملازمت پنجاب آگئے تھے۔
اس لئے غالباً ان کا ذکر رہ گیا ہے۔

مکرمی۔ سلام مسنون

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میرے بڑے بھائی شیخ
ضیاء الحق صاحب ۱۸۶۱ء میں مولوی عبدالحق صاحب ۱۸۶۳ء
میں اور میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا ہوں، مولوی عبدالحق
صاحب نے بھی اپنے ایک تحریر برحصول لائسنس برائے
بندوق۔ اور دوسری تحریر تکمیل فارم بعد حصول پنشن میں
۱۸۶۱ء و ۱۸۶۳ء دونوں قسمیں لکھی ہیں۔

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

از لکھنؤ۔ دارالمبلغین

۶ رماہ مبارک یوم چہارشنبہ ۱۳۵۹ھ

اخی فی دین اللہ زیدت حسناتکم

بعد سلام مسنون۔ گذارش ہے کہ کرم نامہ کا جواب عریضہ کئی دن ہوئے لکھا گیا تھا
لیکن اس خیال سے کہ آپ حضرات کی واپسی بھوپال کی ہو جائے تو عریضہ بھیجوں
اس قدر تاخیر کی گئی۔ حضرت صالح میاں سلمہ اللہ تعالیٰ نے
کی حالت سے جو اپنی مطلع فرمایئے، دعا برابر جاری ہے
اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اور ان کو شفائے کامل عاجل
عطا فرما کر حضرت صاحبزادہ صاحب دام برکاتہم کو
مطمئن فرمائے۔ آمین۔ اس حقیر کی طرف سے سلام مسنون
عرض کر دیجئے۔ براہ راست ان کی خدمت میں عریضہ نہ
بھیجنے کا سبب یہی ہے کہ ان کے تفکر میں اضافہ ہو
انشاء اللہ تعالیٰ اس عریضہ کا جواب ملنے کے بعد پھر
براہ راست حضرت ممدوح کی خدمت میں عریضہ بھیجوں گا
خدانخواستہ گوالیار میں اگر فائدہ نہ ہوا ہو تو پھر
لکھنؤ کے متعلق جو عریضہ سابقہ میں عرض کیا گیا ہے اس
کے متعلق جو رائے عالی ہو اس سے مطلع فرمایئے۔ فقط

والسلام

ناچیز۔ محمد عبدالشکور عفی عنہ

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

از لکھنؤ، دارالمبلغین

۔ ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ

اخی فی الدین حشرنا اللہ تعالیٰ وایاکم فی امرۃ
عبادہ الصالحین۔ وعلیکم السلام ورحمۃ
آپ کی عنایت و محبت کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا
آپ کے دو لفافے اور ایک کارڈ پے درپے پہنچے۔
عزیز القدر کلیم الدین صاحب کا آنا اور قیام کرنا
اگرچہ اقل قلیل وقت کے لئے ہوا۔ بہت موجب
مسرت ہوا۔ خیال تھا کہ مفصل عریضہ بھیجوں مگر نہ ہو سکا
اور جواب کی تاخیر ہو گئی۔ لہٰذا آج اسی کارڈ پر اکتفاء
کرتا ہوں۔ اس حقیر کو اب بخار وغیرہ تو نہیں ہے
مگر ضعف بہت ہے، بعض وقت مسجد تک باہیں
ہمہ قرب نہیں جا سکتا۔ کسی دن ضعف زیادہ ہو جاتا
ہے کسی دن کم، دعائے درازی عمر کی بجائے دعائے
حسن خاتمہ کی حاجت ہے۔ وہ موت عید سے
زیادہ ہے، جو ایمان پر ہو و نعم ما قال العارف
الشیرازی۔

عروسی بود نوبت ماتمت
چو بر نیک روزی بود خاتمت

حضرت صاحبزادہ صاحب دام برکاتہم
کی خدمت میں بھی عریضہ بھیجا ہے۔ خود حاضری
کا ارادہ تھا اور ہے۔ لیکن حالت سفر کرنے کی نہیں
اللہ تعالیٰ کچھ قوت عطا فرمادے اور وہاں پہنچادے
شکور آپا صاحبہ کو اللہ تعالیٰ عافیت عطا فرمائے فقط
والسلام، محمد عبدالشکور عفی عنہٗ

باسمہ تعالیٰ حامداً ومصلیاً

از لکھنؤ دار المبلغین

۵ ربیع الاول چہارشنبہ ۱۳۹۳ھ

امابعد بندہ ناچیز محمد عبدالشکور عفی عنہ کی طرف
سے اخی فی الدین جناب منشی حلیم الدین صاحب
کی خدمت میں معروض ہے۔

وعلیکم السلام رحمۃ اللہ۔ محبت نامہ پہونچا
حضرت صاحبزادہ صاحب دامت برکاتہم
کی ناسازی طبع سے ترددات میں اضافہ ہوا۔
عریضہ حضرت ممدوح کی خدمت میں بھی بھیج رہا ہوں
اور امیدوار ہوں کہ آپ جلد سے جلد حضرت ممدوح
کی خیریت سے مطلع فرماکر مطمئن کریں گے۔ عبدالمومن
کو کل سے کچھ سکون ہے حالت بہت نازک ہوگئی
تھی، مشتاق علی خاں صاحب ایک ہفتہ سے
کہیں گئے ہوئے ہیں، حضرت صاحبزادہ صاحب
کی خدمت مبارک میں سلام پہنچا دیجئے اور دعا
میں یاد رکھئے۔

محمد عبدالشکور عفی عنہٗ

باسمہ تعالےٰ حامداً ومصلیاً

از لکھنؤ دار المبلغین ۱۰ ربیع الاول دوشنبہ ۱۳۹۳ھ

اخی فی الدین حفظکم اللہ تعالیٰ وابقاکم عاجز

وعلیکم السلام ورحمۃ۔ آپ کا کارڈ جس پر
روانگی کی مہر ۴ مارچ ہے کل ۵ مارچ کو پہنچ گیا
بعض حروف مہر کے نیچے آگئے ہیں، پڑھے نہیں جاسکے
کارڈ پڑھ کر میرے حواس مختل ہوگئے اور ایک
ضعف اس قدر طاری ہوا کہ عصر تک میں اٹھ
نہیں سکا، اللہ تعالیٰ حضرت صاحبزادہ صاحب
دامت برکاتہم کا سایہ مبارک ہمارے سروں پر
قائم رکھے اس وقت یہاں کے حالات اور اپنی
بے طاقتی کے باوجود دل چاہتا تھا کہ کل ہی روانہ
ہوجاؤں مگر ریل کا وقت نہ تھا، آج کچھ نئے حالات
رونما ہیں، حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی دعا
حصن حصین کی یا حلیم یا کریم بحرا اشف عبدک
محمد یعقوب المجددی برابر پڑھ رہا ہوں
خداوند کریم جلد خیر خیر و عافیت اس حقیر تک پہونچادے
تار بھی بھیج رہا ہوں، سخت بےچین اور منتظر جواب
ہوں۔　　کتبہ محمد عبدالشکور عفی عنہ　　(باقی آئندہ)

جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی (۱۱ ویں قسط)

ہم گزشتہ مرتبہ آپ کو یہ بتا رہے تھے کہ اغیار نے ہم کو خود ہماری نظروں میں ذلیل و خوار کر دیا اور ہم اپنی زبان سے اپنے آپ کو اور اپنوں کو برا کہنے لگے۔ اس سے ذرا پہلے ہم اپنا اور دوسروں کا بسلسلہ حکومت و حاکم مقابلہ کر رہے تھے اور ہندوستان کی مثال لی تھی کہ ہم نے نامساعد حالات میں کم و بیش سات سو سال حکومت کی اور اغیار ایک صدی میں راہ فرار اختیار کر گئے۔ اس میں ایک خاص اہم پہلو رہ گیا تھا۔ معاف فرمائیے گا۔ اب عرض خدمت کئے دیتا ہوں۔ بندہ نواز مغلوں کی حکومت بھی زوال پذیر ہوئی اور انگریز بھی سدھارے لیکن آخر الذکر یعنی انگریزوں سے یہاں کے رہنے والوں نے ان کی اپنی رعایا نے زمام حکومت چھینی اور ہم سے باہر کے حملہ آوروں نے حکومت لی اس میں بڑا فرق ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ آپ نے کسی فرد کو محبوس کر رکھا ہے اور ہر طرح اس کوشش اور تردد میں ہیں کہ یہ رہا نہ ہو اور وہ خود اپنے دست و بازو کے زور سے آپ کی قید و بند سے نجات حاصل کرے کے اس مقابلہ میں جو صرف آپ کے اور اس کے درمیان تھا اور محکوم نے انجام کار آپ کو شکست دے دی۔ حاکم کی اس سے زیادہ شرمناک شکست کیا ہوگی کہ اپنے ہی محکوم کے ہاتھ سے شکست خوردہ و خجالت نصیب ہو۔ اس کے برخلاف مغلوں سے حکومت یہاں کے باشندوں نے نہیں لی، باہر سے آنے والی ایک طاقت نے اپنے کید و مکر و فریب سے ان کو مغلوب کر لیا۔ سوچنا یہ ہے کہ سات سو سال تک ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کیوں برداشت کی اور ہندوستانی سو سال بھی انگریزوں کی حکومت برداشت نہ کر سکے اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ہم صرف ایک گُر کی بات کہے دیتے ہیں وہ سمجھ لیجئے۔ عزیزو ہمارے اسلامی اخلاق محکوم کا دل موہ لیتے تھے، ان کو دل سے اپنا گرویدہ کر لیتے تھے وہ خود ہمارے وفادار اور جاں نثار بن جاتے تھے۔ الا ماشاء اللہ جن کی فطرت ہی خراب ہو اور احسان فراموشی ان کے خمیر میں ہو ——— ایسے افراد گاہ گاہ سر اٹھاتے اور ان کے اپنے ہی سرکوبی کر دیتے۔ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھ لیجئے ہر سرکش کو کچلنے سزا دینے اور کیفر کردار کو پہنچانے ہم نے اس کے ہم مذہبوں اور ہم قوموں کو بھیجا ——— دوستو ہم مسلمان حکمران شریف نواز تھے، کمینہ پرور نہ تھے ہم اپنے اسلامی اخلاق حسنہ سے ان کو اپنا گرویدہ بناتے، ان کو بے دست و پا اور ذلیل کر کے، حکومت اور تسلط قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ ہم محبت سے حکومت کرتے تھے، اغیار سیاست سے۔ یہی وجہ تھی کہ اس گنگا جمنی زمین پر ہمارا سکہ سات سو سال تک اپنی

آب و تاب دکھاتا رہا اور انگریزوں کا نہ صرف سو سال میں ماند پڑ گیا، بلکہ سونے چاندی کی جگہ کاغذ نے لی اور اس کا بھی کرارا پن ختم ہو گیا ——— اسلام کے پرستار شیر تھے ان کی فطرت میں اسد اللہی تھی، یہ بہادروں کی طرح حکومت کرتے یہ کمینہ سیاست کے پیرو روباہ خصال نہ تھے۔ شیر ہمیشہ سے جنگل کا بادشاہ ہے۔ لومڑی کچھ دیر کو اپنے بھٹ سے نکلتی ہے ایک آدھ چھوٹا موٹا شکار مارتی ہے اور پھر بھٹ میں گھس جاتی ہے۔

حضور اورنگ زیبؒ کا ایک واقعہ یاد آ گیا، اللہ غریق رحمت کرے استاذی شمس العلماء جناب مولوی عبدالرحمن مرحوم کی زبان سے سنا تھا۔ حضور اورنگ زیبؒ کو خفیہ نیان کے ذریعہ اطلاع ملی کہ ایک راجہ سرکشی پر کمر کس رہا ہے۔ حواری جمع کر رہا ہے سازشیں ہو رہی ہیں بغاوت کا ارادہ ہے۔ اس مرد خدا نے اس راجہ کو اطلاع کرائی کہ ہم تمہارے علاقہ میں شکار کے لئے آ رہے ہیں، انتظام کیا جائے کچھ عرصہ بعد پرچم شاہی وہاں لہراتا ہوا پہنچا، راجہ نے اپنی توفیق مطابق انتظام و اہتمام کئے ——— شکار کا دن مقرر ہوا سب جنگل کی جانب روانہ ہو گئے ہانکا دینے والے ہانکا دے رہے تھے، شکاری تیر و سناں سے آراستہ گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے۔ سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کی زنجیریں کھول دی گئی تھیں، ایک ہرن کا تعاقب کرتے ہوئے حضور اورنگ زیب دور نکل گئے، راجہ ہم رکاب گھوڑا ڈالے چلتا چلا گیا۔ ساتھیوں سے دور ایک مقام پر شاہ نے مرکب پر سے اترنے کا ارادہ کیا راجہ نے رکاب کے نیچے ہاتھ رکھا۔ شاہ ایک بڑے سے پتھر پر ٹک گئے گرمی کا موسم تھا۔ گردن کی جڑ میں جو انگرکھے کا تکمہ تھا وہ کھولنے پہلے سے اسے سخت رکھا گیا تھا کہ بآسانی نہ کھل سکے، راجہ کو کھولنے کا حکم ہوا اس نے کوشش کی وہ کامیاب نہ ہوا۔ شاہ نے کمر سے پر طولی نکال راجہ کو دیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا کاٹ دو ——— راجہ کے ہاتھ کانپنے، پر طولی ہاتھ سے گر گیا ——— اب شاہ نے کہا۔ بس اسی ہمت پر عالمگیر اورنگ زیب کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ ہم کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، اسی وجہ سے تمہارے علاقہ میں شکار کے لئے آئے۔ اسی وجہ سے اپنے لشکر سے دور تمہارے ساتھ نکل آئے اپنا خنجر تمہارے حوالہ کر دیا، گلا سامنے کر دیا۔ زبان سے کہہ دیا ہو کاٹ دو اور پھر تم کچھ نہ کر سکے۔ اس سے بہتر کونسا موقع مل سکتا تھا ——— راجہ نے پیر پکڑ لئے، خطا معاف کی گئی ——— مسلمان ان تیوروں سے حکومت کرتے تھے۔

اس دور کے راجپوتوں کو قابو میں رکھنا کوئی کھیل نہ تھا۔ یہ تی جننے والی ماؤں کی اولاد ہوتے تھے کیسری بانا پہن کر میدان میں آتے اور پھر زندہ واپس نہ جاتے تھے۔ ہم نے ان کو اپنایا اور ان کو اپنا بنایا اور ان سے اپنا لوہا منوایا۔ ہم مسلمانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر بنئے بقالوں کی مدد سے حکومت نہیں کی۔ راجہ اور راجہ کے پوت ہمارے تھے، ہم ان شیروں کو رام کرتے اور سدھاتے تھے۔ بہادر کا دوست بہادر ہوتا ہے۔ جی دار کا ساتھ جی دار دیتا ہے۔ شوپ کیپرز کی قوم نے شوپ کیپرز کو اپنایا اور ان کے ذریعے چالاکی اور چالبازی کو بر سر کار لا کر کچھ دن تسلط جمائے رکھا وہ بھی اس شکل میں کہ ان کی سنگینیں سدا ہمارے سینوں پر رہتی تھیں، ان میں سے کسی نے کبھی اپنا گلا آگے کر کے اپنا خنجر ہمارے ہاتھ میں دیکر بہادری کے جوہر دکھا کر ہم کو زیر نگیں نہ کیا۔ ہم بہادر سے زیادہ بہادری دکھا کر، سخی سے زیادہ سخاوت دکھا کر عفو و عطا کی انتہا کر کے پیش کر کے اپنی برتری منواتے تھے ——— یہ تھا فرق ہم مسلمان حاکموں میں اور اغیار حکمرانوں میں۔ یہ تھی وجہ کہ ہم سات گنے زیادہ عرصہ بر سر اقتدار رہے اور ان کا دیا دو دن میں گل ہو گیا۔ ؎ ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بہ کجا۔

کیا کیا لکھوں اور کہاں تک لکھوں ——— غضب خدا کا اغیار مسلمانوں کے اور اسلام کے منہ آ رہے ہیں۔ چوہی بو کی بھی کہہ رہی ہے مجھے گھی سے کھاؤ۔ دنیا کا حافظہ کمزور ہے یہ وہ وقت بھول گئے کہ جب ان کی عورتیں اپنے شبستانوں میں اپنی خوابگاہوں میں راتوں کو بار بار چونک چونک کر اٹھ جاتیں اور یہ کہتی ہوئی کو توں کھدروں میں گھس جاتیں کہ مسلمان آ گئے ہم کو بچاؤ!

یہ وہ وقت بھول گئے جب ایک جانب صرف تیغ ایوبی تھا اور دوسری طرف تمام یورپ کی طاقتیں۔ یہ ابر کی طرح اٹھتے اور کائی کی طرح کٹ جاتے جس طرح برق جہندہ گہری سے گہری گھٹا کو شق کر دیتی ہے۔ اس طرح ہماری تلواریں ان کے دل کے دل کاٹ دیتی تھیں چھانٹ دیتی تھیں ــــــ یہ جرأت یہ شجاعت یہ تہور اور بے جگری ہم کو اسلام نے عطا نہیں کی تھی تو اور کس نے عطا کی تھی ورنہ جو دو ہاتھ ہمارے پاس تھے وہی ان کے پاس ان کی تعداد ہم سے کہیں زیادہ تھی اور اسلحہ ہم سے بہتر۔ ہمارے اور ان کے درمیان صرف اسلام اور تعلیم اسلام اور جذبۂ اسلام کا فرق تھا جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گا ــــــ اب ہم اس کردار ساز تعلیم سے دور ہو گئے، جذبہ کم و کم تر ہو گیا۔ بنا بریں ہماری وجہ امتیاز نہ رہی اور ہم کچھ عرصہ کے لئے اپنے غلط کردار کے سبب قدرے پست مقام پر آ گئے لیکن اللہ کا شکر ہے ہمارا دور ابتلا انجام کے قریب ہے اس کے فضل و کرم سے ہم پھر وہ بہ عروج ہیں اس سے اغیار گھبرائے ہوئے ہیں اور ہمارے درپے اپنی پوری طاقت بر سر کار لا رہے ہیں تاکہ یہ اسد نیستاں پھر اپنی تاب و تواں کے ساتھ میدان میں نہ آ جائے۔ اللہ کارساز ہے ہماری امیدیں اسی سے وابستہ ہیں انشاء اللہ اپنے نبی اپنے حبیب کی امت کو پھر امتیازی مقام اور ممتاز شان بخشے گا۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ــــــ

ــــــ ہم چند سطور قبل آپ سے عرض کر رہے تھے محکوم کا ذہن بطیب خاطر ہم کو قبول کرتا ہم اس پر مسلط نہیں ہوتے تھے ــــــ

ــــــ ہم وہ ہیں کہ جب عارضی طور پر ہم رومنز کے بے اندازہ دباؤ کے تحت بیت المقدس چھوڑ کر جا رہے تھے اس وقت عساکر اسلامی دیگر کئی محاذوں پر تھے اس وجہ سے ہماری طاقت بہت ہی کم تھی بہر حال جب ہم بیت المقدس سے جا رہے تھے اور اپنے ذمیوں کا جزیہ حسب حکم خدا واپس کر رہے تھے اس وقت ان کی دعا تھی کہ رب قدیر تم کو پھر یہاں لائے۔ یہ تھے ہمارے اخلاق اور یہ تھا ہمارا انداز حکومت اور یہ سب کچھ اسلام ہی کا صدقہ تھا۔

شہنشاہ اکبر سپہ گری کے فن دیکھ رہا ہے افواج کے افراد مظاہرہ کر رہے ہیں دو بھائی راٹھور قبیلہ کے رکاب بوس ہوتے ہیں۔ شاہ مدعا دریافت کرتا ہے، عرض کرتے ہیں کہ سپاہی بچے ہیں اور ملازمت کے خواہاں، حکم ہوتا ہے کہ کچھ کر کے دکھاؤ۔ یہی گود یہی میدان۔ دونوں بھائی نیزہ استوار کر اپنے مرکبوں پر سوار کچھ فاصلہ درمیان میں آمنے سامنے سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں اور سخت زخمی ہو کر گرتے ہیں۔ قریب ہی ایک کچی دیوار ہے مہابلی اپنی تیغ کا قبضہ اس دیوار میں ٹھونس دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اپنا سینہ نوک تیغ پر رکھ کر جھکولا مارے کہ ٹوڈرمل کمر پکڑ لیتا ہے، اکبر انگوٹھا چیر کر اپنے کو چھڑانا چاہتا ہے۔ ٹوڈرمل کی کلائی پھٹ جاتی ہے اتنے میں دوسرے نمک خوار تلوار اور شاہ کے درمیان آ جاتے ہیں۔ اکبر بحالت مجبوری ارادہ ترک کر دیتا ہے اور کہتا ہے ٹوڈرمل تم نے غضب کیا۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ کسی کو جرأت کا نمونہ پیش کرتے دیکھوں اور خود بھی اس بڑھ چڑھ کر نہ دکھاؤں اس قسم کے تہور میں خون تیموری کو بھی دخل تھا تاہم یہ تھیں ہماری حکومت کی ادائیں ــــــ حجاج بن یوسف تاریخ اسلام کا بدنام ترین فرد۔ اپنے سپہ سالاروں کو لکھ رہا ہے کہ حملہ کے وقت سالار اپنی سپاہ کے آگے ہونا چاہئے اور لوٹتے ہوئے سب کے پیچھے۔ ہم اور ہمارے سالار محاذ جنگ سے سیکڑوں میل پیچھے ایرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر جنگیں نہیں لڑاتے تھے اور اسی شان اور آن بان کا مظاہرہ اللہ الصمد ہم نے اپنی حالیہ سترہ دن کی جنگ میں کر دکھایا ــــــ

یہ ہے وہ کردار جو اسلام ہم کو عطا کرتا ہے یہ ہے وہ ادا جو لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے طفیل ہم میں پیدا ہوتی ہے ــــــ اسلام کی ادائیں اغیار کیا جانیں یہ تو اسے عناد فساد اور تعصب کی عینک کے پیچھے سے دیکھتے ہیں شب پرک سورج کی روشنی کو سمجھ ہی نہیں سکتی اس کی آب و تاب سے اندھی ہو جاتی ہے۔ بوم بدخصال آفتاب جہاں تاب کی شان سے کب آشنا۔ اسلام کو برا کہنے والوں کی ش

جسم اور روح میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ جسم اگر پاک اور صاف نہیں ہے تو روح بھی طہارت سے محروم ہی رہے گی۔ اسلام ایک انقلاب آفریں مذہب ہے۔ اس نے ہر گوشۂ حیات میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ جس زمانہ میں لوگ مظاہر پرستی کے خوگر تھے بت پرستی کو شعار بنائے ہوئے تھے، کئی کئی خداؤں کو پوجتے تھے اس وقت اسلام نے توحید کا درس دیا۔ ایک خدا صرف ایک تھا۔ واحد احد۔ حی۔ لایموت۔ جس زمانہ میں غسل کرنا۔ صاف رہنا۔ ناخن ترشوانا اور صفائی و طہارت کے دوسرے لوازم بعض مذاہب کے بے شمار ماننے والوں کے نزدیک جرم تھے اسلام نے پاکی، طہارت اور صفائی کا حکم دیا۔ قرآن کے متعلق فرمایا لا یمسہ الا المطھرون یعنی اس صحیفۂ ربانی کو وہی ہاتھ لگا سکتے ہیں جو طاہر ہوں۔ یعنی پاک اور صاف ہوں اور ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن امت مسلمہ کا دستور حیات اور آئین زندگی ہے۔ اسے پڑھنا اس کی تلاوت کرنا اس کی ورق گردانی کرنا اس کی سورتوں اور آیتوں سے استفادہ اور افادہ ہر مسلمان کے لئے ضروری اور لابدی ہے۔ اور یہ ضرورت اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم پاک اور طاہر نہ ہوں۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو طاہر ہوں۔

اسلام عرب میں نمودار ہوا۔ اس خطۂ ارض کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ ریگ زار تھا، یہاں پانی کمیاب بلکہ نایاب تھا۔ اس پانی کی تلاش میں یہ قوم بڑی حد تک خانہ بدوش بن گئی تھی، جہاں نخلستان نظر آیا خیمے ڈال دیئے۔ جہاں شادابی دکھائی دی پڑاؤ کر دیا۔ جہاں کوئی چشمہ ابلتا ہوا نگاہ سے گذرا وہیں قیام کر لیا۔ جہاں سرسبزی اور شادابی اور روئیدگی کی جھلک نظر آئی وہیں سفر قیام سے بدل گیا۔ وہ پانی کا گھاٹ ہی ہوتا تھا جہاں عرب نوجوانوں کا رومان پروان چڑھتا تھا جس کا ذکر عرب شعرائے جاہلی نے مزے لے لے کر کیا ہے۔ ان استثنائی صورتوں کے علاوہ سارا ملک بنجر اور بے آب و گیاہ تھا۔

ان حالات میں اگر اسلام نے ظاہری اور جسمانی صفائی اور طہارت کو نظر انداز کر دیا ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن اسلام نے ایسا نہیں کیا۔ پانی کی اس کمیابی اور نایابی کے باوجود اس نے غسل پر زور دیا ہے اور دن میں پانچ بار وضو لازمی قرار دیا ہے جو غسل کے قائم مقام ہے۔ اور اگر وضو بھی میسر نہ ہو تو تیمم کو وضو کا قائم مقام بنایا ہے۔ ان مراحل سہ گانہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں صفائی اور

طہارت کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ ممکن ہی نہیں کہ صفائی اور پاکیزگی کو نظر انداز کیا جا سکے یہ ہمارا قومی شعار ہے اس سے دست برداری ممکن ہے نہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کی ایک جداگانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر نیک اور اچھا کام عبادت ہے۔ راستے کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر دینا، ناپاکی اور نجاست کو دور کر دینا۔ غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے نہ صرف دامن بچانا بلکہ دوسروں کے لئے بھی یہی چاہنا اور اس سلسلے میں امکانی خدمت کرنا یہ سب نیک اور اچھے کام ہیں، لہذا بلاشبہ یہ عبادت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسلام ہر نیک اور اچھے کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں صفائی پاکی اور طہارت بھی شامل ہے۔

اسلام کی بہت سی چیزیں دوسروں نے دوسری قوموں اور ملتوں نے اپنا لی ہیں۔ ذہنی اور موروثی اور سماجی تعصب کے باعث اسلام قبول کرنا ان کے لئے آسان نہیں ہے لیکن اسلام کے اصولوں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہذا اسلام سے قطع نظر کر کے اس کے اصولوں کو انھوں نے اپنانا شروع کر دیا ہے اور اس کے بہترین ثمرات و نتائج سے وہ بہرہ ور بھی ہو رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حقائق سے ہم کب تک آنکھیں بند کئے رہیں گے۔

شیخ منصور المحجوب

چیف جسٹس لیبیا سے ایک ملاقات

محمد تقی عثمانی

- بین الاقوامی اسلامی کانفرنس
- لیبیا کا عدالتی نظام
- دنیا بھر کے جرائم میں اضافہ کیوں؟
- اسلامی سزائیں
- اسلام میں سنت کا تصور
- عالم اسلام اور مغربی تہذیب

لیبیا افریقہ کا مشہور اسلامی ملک ہے جو مصر اور الجزائر کے درمیان واقع ہے۔ یہاں کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شیخ محمد منصور المحجوب کا نام تو پہلے بار بار سُنا تھا، لیکن ان سے پہلی ملاقات ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ کی شام کو چکلالہ ایرپورٹ کے وی آئی پی روم میں ہوئی۔ یہ راولپنڈی میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا پہلا دن تھا، بیشتر ملکی و غیر ملکی مندوبین پہنچ چکے تھے اور سہ پہر کو تین بجے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کے وسیع لان میں کانفرنس کے افتتاح کی رسمی تقریب شروع ہو چکی تھی، البتہ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم جو اپنی علالت کی بنا پر ابھی تک پنڈی نہیں پہنچ سکے تھے، شام کو سوا چار بجے کے طیارے سے تشریف لانے والے تھے، انڈونیشیا کے ایک مندوب پروفیسر ابراہیم حسن بھی اسی طیارے سے تشریف لا رہے تھے

ٹھیک سوا چار بجے پی آئی اے کا ٹرائیڈنٹ طیارہ زمین پر اترا، اور اس میں سے حضرت والد صاحب مدظلہم اور پروفیسر ابراہیم حسن کے علاوہ مجھے ایک اور پُرکشش شخصیت اترتی نظر آئی، دراز قد، بھرا ہوا جسم، معصوم اور باوقار چہرہ، سر پر خوبصورت عمامے کے ساتھ سرخ ٹوپی، اور گردن سے ٹخنوں تک اونی جبہ پہنے ہوئے جب یہ ذرا قریب آئے تو میں استقبال کے لئے آگے بڑھا، انھوں نے مسکرا کر مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ "منصور المحجوب من لیبیا"

اس سے قبل کانفرنس کے منتظمین نے مجھے یہ بتلایا تھا کہ شیخ منصور المحجوب کسی عذر کی وجہ سے تشریف نہیں لا رہے، اس لئے اچانک یہ سنکر مجھے حیرت کے ساتھ بڑی مسرت ہوئی۔ وی آئی پی روم میں رسمی مراحل طے کرانے کے بعد جب ہم ہوٹل جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو انھوں نے بتایا کہ مسلسل سفر کی بنا پر وہ تین راتوں سے سو نہیں سکے اور سخت تھکن کی وجہ سے آج کی مجلس میں شریک ہونا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل پہنچ کر وہ سیدھے کمرے میں چلے گئے، اور صبح تک کسی پروگرام میں شریک نہیں ہوئے ——— اگلی صبح جب میں کانفرنس ہال جانے کے لئے اپنے کمرے

نیچے اترا تو وہ لابی میں کھڑے تھے، میں نے سلام کے بعد ان سے پوچھا

"فرمایئے، رات کیسی گذری"؟

انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "رات بستر پر لیٹنے کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا اب میں بالکل تازہ دم ہوں"۔

اس کے بعد ہم باتیں کرتے ہوئے کانفرنس ہال تک آگئے۔

محب محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ الحق (اکوڑہ خٹک) بھی ان دنوں پنڈی میں موجود تھے۔ ایک بجے کے قریب اجلاس سے فارغ ہو کر ہم دونوں شیخ محجوب کے کمرے میں چلے گئے، کافی دیر تک ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، بالآخر ہم نے "البلاغ" اور "الحق" کے مختصر تعارف کے بعد ان سے ایک انٹرویو کی فرمائش کر دی، اس پر انھوں نے کہا۔

"کانفرنس کی مصروفیات تو آپ کے سامنے ہیں

آپ ایسا کریں کہ کسی وقت سوالات لکھ کر مجھے

دیدیں مجھے جس وقت بھی مہلت ملے گی ان کا

تحریری جواب پیش کر دوں گا"۔

چنانچہ اسی روز شام کو میں نے کچھ سوالات لکھ کر انھیں پہنچا دیئے۔ لیکن اس کے بعد کے پروگرام اس قدر مسلسل تھے کہ جب تک میں راولپنڈی میں رہا، ان سے بس آتے جاتے علیک سلیک ہوتی رہی اور کسی تفصیلی ملاقات کا موقعہ نہ مل سکا۔

پھر ۱۹ ذیقعدہ کو جب میں لاہور پہنچا تو جامعہ اشرفیہ کے ایک جلسے میں ان سے پھر ملاقات ہوئی، انھوں نے کہا۔

میں شرمندہ ہوں کہ آپ کے سوالات کا جواب

اب تک نہیں لکھ سکا، کل دس بجے کے قریب میں کراچی

واپس جا رہا ہوں۔ آپ اگر صبح ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل

میں مجھ سے مل لیں تو بڑا اچھا ہو"۔

میں نے صبح آنے کا وعدہ کر لیا اور جب اگلی صبح میں ہوٹل پہنچا تو ان کے ہوائی اڈے کے لئے روانہ ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے جلدی سے سوالات کا پرچہ نکالا، اور مسکرا کر کہنے لگے

"میں اب بھی جوابات لکھ نہیں سکا، اب زبانی ہی کچھ باتیں ہو جائیں"۔

اور اس طرح گفتگو شروع ہو گئی، میں نے پوچھا:

"لیبیا میں عدالت اور قضاء کے نظام کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایئے"۔

"لیبیا میں دو قسم کی عدالتیں ہوتی ہیں"۔

شیخ نے اطمینان کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"ایک شرعی عدالتیں، جن میں دینی امور کے فیصلے کئے جاتے ہیں، اور دوسری مدنی (سول) عدالتیں جن میں حقوق شہریت سے متعلق مقدمات کی سماعت ہوتی ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں، ابتدائی عدالتیں جن کی طرف ہر مقدمے میں ابتداءً رجوع کیا جاتا ہے، اور مرافعہ

کی عدالتیں جن میں

ابتدائی عدالت کے فیصلوں پر نظر ثانی کی جاتی ہے

پھر ان تمام عدالتوں کے اوپر ایک محکمۂ علیا (سپریم کورٹ) ہے جس میں شرعی اور مدنی دونوں قسم کے تنازعات کا تصفیہ ہوتا ہے، اس محکمۂ علیا، کا کام یہ ہے کہ وہ عدالتہائے مرافعہ کے فیصلوں پر نظر ثانی کرتا ہے، انتخابات کے سلسلے میں جس قدر اعتراضات ہوتے ہیں اسی عدالت کے سپرد ہوتے ہیں۔ نیز دستوری تنازعات کا فیصلہ بھی اسی کی ذمہ داری ہے یہ عدالت اپنے مالی اور انتظامی امور میں ایک آزاد ادارہ ہے جو ایک جنرل باڈی کی نگرانی میں کام کرتا ہے"۔

"قاضیوں کے عزل و نصب وغیرہ کا اختیار کس کو ہے؟" میں نے پوچھا

"قاضیوں کے عزل و نصب اور ترقی و تنزل وغیرہ کے جملہ امور ایک مخصوص جماعت کے سپرد ہیں جو "مجلس اعلیٰ للقضاء"

کہلاتی ہے، محکمۂ علیا کا رئیس القضاۃ (سپریم کورٹ کا چیف جسٹس) اس جماعت کا صدر ہوتا ہے، اور ملک کے بڑے بڑے ماہرین قانون اس کے رکن ہیں۔

یہ تمام قاضی خواہ کسی قسم یا کسی درجے کی عدالت سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے فیصلوں میں قطعی طور پر آزاد ہوتے ہیں، اور قانون کے سوا ان پر کسی کی بالادستی نہیں ہوتی۔"

شیخ محجوب یہاں تک پہنچکر رک گئے تو میں نے پوچھا:

"لیبیا میں قوانین کا بنیادی ماخذ کیا ہے؟"

فرمانے لگے۔

"بعض جزوی قوانین نظرثانی کے محتاج ہو سکتے ہیں، لیکن لیبیا میں بنیادی طور پر اسلامی شریعت ہی کو ماخذ قانون قرار دیا گیا ہے۔"

"سماحۃ الشیخ!" میں نے کہا: "آجکل پوری دنیا جرائم و مظالم کے روزافزوں اضافے سے بری طرح تنگ آئی ہوئی ہے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ جرائم کا بڑا سبب افلاس ہوتا ہے، لیکن آج دنیا کے خوش حال ترین ممالک میں جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ قانونی مشنریوں کی کمی یا کمزوری کو جرائم کے اضافے کا سبب قرار دیا جاسکتا تھا، مگر ہماری آنکھوں کے سامنے جتنا اضافہ قانونی مشنریوں میں ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جرائم بڑھ جاتے ہیں، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس مرض کا کوئی علاج بھی ممکن ہے؟"

میرے اس سوال سے ان کے لبوں پر ایک مغموم مسکراہٹ نمودار ہوئی، وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے، اس کے بعد انھوں نے رک رک کر بولنا شروع کیا:

"اس سوال کا جواب بڑا طویل ہے تقی صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت انسانیت کی باگ ڈور ہے وہ انسان اور خاص طور سے مجرم کی نفسیات کو نہیں سمجھ سکے، ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ذہن کی صحیح تربیت کے بغیر صرف قانونی جکڑ بندیوں سے جرائم کا انسداد کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ قطعی طور پر غیر فطری ہے اور اس سے اصلاح احوال کی توقع رکھنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔"

یہاں پہنچکر ان کے لہجے میں بلا کی روانی آگئی، وہ قدرے جوش کے ساتھ کہنے لگے۔

"موجودہ دنیا نے تو مادہ اور نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا ہے اور اس کی تمام تر سرگرمیاں اسی پہیے کے گرد گھوم رہی ہیں، انسان کو خوب اچھی طرح یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ تیری زندگی کا منتہائے مقصود مادی منافع کا حصول اور نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے، اس کے ذہن سے یہ بات محو کردی گئی ہے کہ اس دنیا میں چند سال گذارنے کے بعد اسے کہیں اور بھی جانا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی چند روزہ زندگی کو اپنا سب کچھ سمجھتا ہے، جب اسے جائز طریقوں سے اس زندگی کا عیش میسر نہیں آتا تو وہ اپنے آپ کو محروم سمجھتا ہے، بس یہی احساس محرومی ہے جو اُسے جرم اور گناہ کی طرف لیجاتا ہے پھر آپ نرے قانون کے ڈنڈے کے بل پر اُسے ارتکاب جرم سے نہیں روک سکتے، تنہائی اور تاریکی میں اسے کسی کا خوف نہیں ہوتا اس لئے وہ بڑی آسانی سے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، پھر جب اسکی خواہشات اور جسارتیں بڑھتی ہیں تو آبادی اور اجالے میں بھی وہ کھلے بندوں قانون سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر میں محرومی اور اسیری دونوں برابر ہیں۔"

"پھر آخر اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ہم رجعت پسندی کے مہمل طعنے سے ڈرنا چھوڑ دیں

تو اس کا بڑا اچھا حل ہمارے پاس موجود ہے،
اور وہ ہیں اسلامی تعلیمات!" انھوں نے کہا۔
"اسلام کی وہ کونسی تعلیمات ہیں" میں نے عرض کیا" جو اس مشکل کا حل پیش کرتی ہیں؟"
انھوں نے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا:
"دراصل اسلام نے اول تو اس بات کی کوشش کی ہے کہ جرائم خود بخود کم سے کم سرزد ہوں، اس کے لئے اس نے قانونی مشینریوں کی افراط کرنے سے زیادہ خوف خدا اور عقیدۂ آخرت پر زور دیا ہے۔ سب سے پہلے انسانی ذہن کو اس رخ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ نہ سمجھے۔ پیٹ اور مادے ہی کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے، بلکہ عمل صالح اور آخرت کی بہبود کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے کر اسی منزل کی جستجو کرے۔ غور فرمائیے کہ جب ایک شخص اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر لیتا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اور اس کے بعد ایک ابدی زندگی آنے والی ہے تو اگر اس دنیا میں اسے کچھ تنگی ترشی بھی برداشت کرنی پڑے تب بھی وہ اس تنگی کو رفع کرنے کے لئے اپنی آخرت خراب نہیں کرے گا، اور یہ تنگی ترشی اس کے دل میں وہ محرومی کا احساس پیدا نہیں کرے گی جو میرے نزدیک جرائم کی جڑ ہے۔
لہذا اسلام نے سب سے پہلے تو ایسی ذہنیت کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے جو مادی اغراض کے حصول کے بجائے آخرت کی بہبود کو اپنا منتہائے مقصود قرار دے۔ پھر مجموعی طور سے ماحول ایسا پیدا کیا ہے جس میں جرائم کے امکانات کم سے کم ہو جائیں، لیکن ان حفاظتی تدابیر کے بعد بھی اگر کوئی بدباطن شخص جرم سے باز نہ رہ سکے تو پھر اس کے ساتھ کسی رحم کے سلوک کو اس نے گوارا نہیں کیا۔ وہ معاشرے کا سڑا ہوا عضو ہے جسے کاٹنے کے لئے ایسی حدودِ شرعیہ نافذ کی گئی ہیں۔ جو ایک مرتبہ جاری ہو جائیں تو سالہا سال تک لوگوں کے لئے عبرت کا سامان بن جائیں!"
"لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حدودِ شرعیہ اسلام کے ابتدائی دور کے ساتھ خاص تھیں۔ اب ہمارے لئے ان کی پابندی ضروری نہیں رہی؟" میں بیچ میں بول اٹھا۔
"ایسا کون کہتا ہے۔" انھوں نے ذرا تعجب سے کہا" قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی ایک زمانے کے لئے نازل نہیں ہوئے تھے، ان کے مخاطب ہر دور اور ہر زمانے کے لوگ ہیں، لہذا قیام قیامت تک، ہمارے لئے ان کے تمام تشریعی احکام کی پابندی ضروری ہے، اور ان میں شرعی حدود بھی داخل ہیں!"
"مگر ان کا کہنا یہ ہے کہ سنت سے مراد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے۔ بلکہ ہر زمانے کے مسلمانوں کی سنت بھی اس میں شامل ہے، لہذا اگر کسی زمانے کے مسلمان قرآنی احکام کے سلسلے میں کوئی نیا طرزِ عمل اختیار کریں تو وہ بھی سنت ہے۔ خواہ وہ پہلے مسلمانوں کی سنت کے خلاف ہو"۔ میں نے کہا
"میں پہلی بار آپ سے یہ عجیب و غریب بات سن رہا ہوں،" انھوں نے کہا۔
میں تو اتنا جانتا ہوں اور اسی کو پوری امت کا عقیدہ سمجھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کا بیان فرمودہ طریقۂ زندگی ہمارے دین و دنیا دونوں کے لئے صلاح و فلاح کا ضامن ہے اور یہ طریقہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں قابل عمل بلکہ واجب العمل ہے، ہم اس طریقے کے بجائے اپنی طرف سے

گھبرا کر جو طریقہ بھی اختیار کریں گے وہ ہمیں ناکامی کی طرف لے جائے گا۔"

شیخ مجوب کی اس بات پر مجھے وہ حضرات یاد آگئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی اندھی تقلید کے بغیر مسلمان کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے، اس سلسلے میں نے ایک اور سوال کیا:

"مغربی تہذیب کے ردّ و قبول کے سلسلے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟"

انھوں نے جواب دیا۔

"میرے نزدیک مغربی تہذیب کے معاملے میں مسلمانوں کو بڑی احتیاط، بیدار مغزی اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی جو چیزیں مفید اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں انھیں ضرور اختیار کیجئے، بلکہ ان میں سے بیشتر چیزیں وہ ہیں جو میرے خیال میں اسلام ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً جذبۂ تحقیق و جستجو، جہد و عمل کا شوق وغیرہ انہیں چیزوں کے نتیجے میں انہوں نے جو مفید آلات اور صنعتیں ایجاد کی ہیں ان سے ضرور نفع اٹھانا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کا ایک نہایت تاریک رخ بھی ہے، فحاشی و عریانی، رقص و سرود، تصنع اور تکلف، مادہ پرستی یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو مغربی تہذیب کے بدترین مظاہر ہیں، اور انھوں نے انسانیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے، افسوس کہ ہم میں سے بیشتر لوگ اول الذکر چیزوں میں تو مغرب کی مطلق تقلید نہیں کرتے، اور مؤخر الذکر معاملات میں ان سے بھی آگے بڑھ جانے کی فکر میں ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں فکر سلیم عطا فرمائے۔"

"آمین!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا، اور اتنے میں لیبیا کے سفارت خانے کے لوگ شیخ مجوب کے لئے گاڑی لے کر آگئے۔ انھوں نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملائے، معانقہ کیا اور "فی امان اللہ" کہہ کر رخصت ہو گئے ——— !

بقیہ مضمون "سخن راست"

انگور کھٹے کی ہے۔ چونکہ اس دولت سے محروم ہیں۔ اس روشنی کی چکاچوند سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اس کے پرستار جب اس روشنی سے جلب ضیا کر رہے تھے اس وقت کے زخم خوردہ ہیں اسی وجہ سے شب و روز اس پر رکیک حملے کرتے رہتے ہیں ہم کو ان سے اور ان کی عیب جوئی سے خاص سروکار نہیں ہمارا مدعا صرف اتنا ہے کہ ہمارے اپنے ان کی عیب چینی کے دھوکہ میں نہ آجائیں اور اپنے زرخالص کو اپنے کندن کو کھوٹا نہ خیال کرنے لگیں۔ یہ مال کم عیار کے سوداگر تمہاری جنس کو تمہاری نظروں میں گرا کر اپنی جنس کا معیار بلند کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تم اسلام کی حقیقت کو پہچان لو اس دولت کے مقام کو سمجھ لو اور ان چرب زبان بدخواہوں کی چرب زبانی میں نہ آؤ۔

صلائے تحقیق

حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ نے فرمایا تھا کہ

"شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمے سے دو سو برس پیشتر بھاشا (بھاکا) میں نہایت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے، ہم نے دیکھا ہے"

قرآن شریف کے اس ترجمہ کے متعلق اہل علم کی تحقیق، وکاوش کے لئے "البلاغ" کے صفحات حاضر ہیں!

حضرت زکی کیفی

زائرین حجاز کی خدمت میں

یہ حج و زیارت مبارک ہو تمکو　　متاعِ سعادت مبارک ہو تمکو
وہ ہر سمت انوار، ہر سُو تجلّی　　وہ نورِ ہدایت مبارک ہو تمکو
وہ احرام میں مست و سرشار رہنا　　غموں سے فراغت مبارک ہو تمکو
اذانِ سحر کا حرم میں وہ منظر　　وہ کیفِ سماعت مبارک ہو تمکو
مبارک ہوں وہ ملتزم پر دعائیں　　وہ ذوقِ عبادت مبارک ہو تمکو
وہ میزابِ رحمت کے نیچے نمازیں　　بشوقِ اطاعت مبارک ہو تمکو
مبارک ہوں وہ سنگِ اسود کے بوسے　　لبوں کی حلاوت مبارک ہو تمکو
وہ رکنِ یمانی پہ رحمت کے بادل　　وہ آثارِ رحمت مبارک ہو تمکو
وہ پی پی کے زمزم کو سیراب ہونا　　وہ کوثر کی لذّت مبارک ہو تمکو
منیٰ میں رمی کا وہ پر کیف منظر　　وہ جلووں کی کثرت مبارک ہو تمکو
وہ عرفات میں خیمہ زن ہو کے رہنا　　بزہد و قناعت مبارک ہو تمکو
مدینہ کی گلیوں کا دیدار کرنا　　وہ دنیا کی جنت مبارک ہو تمکو
وہ روضہ کو باچشم نم دیکھ لینا　　وہ دل کی طہارت مبارک ہو تمکو
قبا و بقیع و احد کی زیارت　　بحسنِ ارادت مبارک ہو تمکو
وہ فیضانِ انوار روضے کے باہر　　وہ لطف و عنایت مبارک ہو تمکو
مواجہ میں آکر جلا دِل کو دینا　　وہ جلوت میں خلوت مبارک ہو تمکو
نکل پڑنا آنسو وہ ذکرِ نبیؐ پر　　یہ دل کی نزاکت مبارک ہو تمکو
وہ روضہ کی جالی پہ سر رکھ کے رونا　　دعائے شفاعت مبارک ہو تمکو

دعا ہے یہ کیفی کے قلبِ حزیں کی
یہ حج و زیارت مبارک ہو تمکو

بارھویں حدیث

وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ قَدِمَتْ عَلَيَّ أُمِّي وَهِيَ مُشْرِكَةٌ فِي عَهْدِ قُرَيْشٍ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ أُمِّي قَدِمَتْ عَلَيَّ وَهِيَ رَاغِبَةٌ أَفَأَصِلُهَا قَالَ نَعَمْ صِلِيهَا۔

(رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: نیز حضرت اسمار رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ میری والدہ اس زمانہ میں مدینہ منورہ آئیں جبکہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ سے معاہدہ کر رکھا تھا، اس وقت تک وہ مسلمان نہ ہوئی تھیں بلکہ مشرک تھیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میری والدہ آئی ہیں جو مجھ سے کچھ ملنے کی امیدوار ہیں، کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کروں (اور ان کو جب توفیق کچھ دیدوں؟) آپ نے فرمایا ہاں ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔

لہ بالباء والمیم روایتان والاولی اکثر والشہر ومعنی کونہا راغبۃ مائلۃ الی ال ایثھا اوراغبۃ فی الاسلام اوعن الاسلام قیل ہذا نسب بالمقام ومعنی کونہا راغمۃ ربالمیم ذلیلۃ ومحتاجۃ وہو موافق لاحد المعانی المذکورۃ فی الروایۃ الاولٰی وقد اخترناہ لکونہ اقرب الے الفہم والسیاق۔

تشریح

حضرت اسمار اور ان کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تو بہت پہلے مسلمان ہو گئے تھے، بلکہ حضرت ابوبکر رضہ تو بالغ مردوں میں سب سے پہلے مسلمان ہیں۔ لیکن حضرت اسمار رضہ کی والدہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئی تھیں جس وقت کا یہ قصہ ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کی ایذاؤں سے تنگ آ کر اپنے اصلی وطن اور باپ دادوں کے دیس یعنی مکہ معظمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، جس کو ہجرت کرنا کہتے ہیں، کافروں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور لڑائیاں لڑتے رہے جس کے نتیجہ میں جنگ بدر اور جنگِ احد ہوئی۔ ان دونوں جنگوں کے قصے مشہور ہیں اور تاریخ اسلام میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ جب مسلمانوں نے کافروں کے مقابلہ میں جوابی کارروائی کی تو کافروں کے دانت کھٹے کر دیئے اور ان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اگرچہ مسلمان اس زمانہ میں بہت ہی کم تھے اور کافروں کی تعداد بہت زیادہ تھی، مگر مسلمانوں کی ہمت بہت زیادہ اور ایمان مضبوط اور پکا تھا، اللہ کے لئے مرنے سے محبت کرتے تھے، اس لئے کافران کو نیچا دکھا سکے اور خود مجبور ہو کر دس سال کیلئے خاص خاص شرطوں پر صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ صلح ۶ھ ہجری میں ہوئی اس میں طے ہوا تھا کہ فریقین میں کوئی

ایک دوسرے پر حملہ نہ کرے گا، چونکہ یہ صلح مقام حُدَیْبِیَہ
میں ہوئی اس لئے صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے صلح ہو جانے
کے بعد فریقین کو امن مل جانے کے باعث آپس میں ملنا جلنا اور
ایک دوسرے کے پاس آنا جانا شروع ہوا۔ مذہب کے لحاظ
سے گو دشمنی تھی مگر فریقین کے آپس میں خونی رشتے تھے جن کی وجہ
طبعی طور پر ملاقاتوں کو جی چاہتا تھا، حال یہ تھا کہ بیٹا کافر
ہے تو باپ مسلمان اور باپ کافر ہے تو بیٹا مسلمان، ماں کافر
بیٹی مؤمن، ایک بھائی راہ حق پر، دوسرا دین مشرک پر
ایک بتوں کا پجاری دوسرا مالک حقیقی، پرستار، جو مسلمان
تھے سارا دھن دولت مکہ میں چھوڑ کر قرابت داری کے تقاضوں
کو پس پشت ڈال کر مدینہ منورہ میں آ کر بس گئے تھے، کیونکہ ان کے
دل میں اللہ بس گیا تھا۔

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں جب امن ہوا اور ملاقات کا
موقعہ نکلا تو بعض لوگوں نے اپنے عزیزوں سے ملنے کا ارادہ کیا،
اسی زمانہ میں حضرت اسماء رضی اللہ تعالٰی عنہا کی والدہ مکہ سے
مدینہ میں آئیں۔ حدیث میں فِیْ عَھْدِ قُرَیْشٍ کا یہی مطلب ہے
یہ ابھی تک مسلمان نہ ہوئی تھیں اور چونکہ ضرورت مند تھیں اس لئے
ان کی خواہش تھی کہ بیٹی سے کچھ ملے لیکن بیٹی اب صرف بیٹی نہ تھی
بلکہ حق کی متوالی اور احکام اسلام کی رکھوالی تھی سوچا کہ ماں
اگرچہ ماں ہے مگر ہے تو مشرک۔ اس پر خرچ کرنا اللہ کی رضا
کی خلاف تو نہیں؟ دل میں کھٹک ہوئی، بارگاہ رسالت میں
حاضری دی اور عرض کیا یا رسول اللہ میری والدہ آئی ہیں،
ان کی تمنا ہے کہ ان کی مالی امداد کروں، اس بارے میں جو کچھ ارشاد
ہو عمل کروں! رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی
مدد کرو اور صلہ رحمی کا برتاؤ کرو۔

درحقیقت اسلام عدل وانصاف کا مذہب ہے
کفر کی وجہ سے جو مذہبی دشمنی ہو اس کے ہوتے ہوئے ماں باپ
کی خدمت اور مالی امداد کا بھی سبق دیتا ہے۔ ماں باپ کے
کہنے سے کفر و شرک اختیار کرنا یا کوئی دوسرا چھوٹا بڑا گناہ
کرنے کا تو اختیار نہیں ہے مگر ان کی خدمت کرنا اور ضرورت مند
ہوں تو ان پر خرچ کرنا ضروری ہے۔ اگر ان کی کفالت کا کوئی
دوسرا انتظام نہ ہو تو ان کی کفالت کرنا واجب ہے اگرچہ
ماں باپ کافر ہوں، قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ
فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ
مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ط

اور اگر وہ دونوں (ماں باپ) تجھے مجبور کریں اس
بات پر کہ تو میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک
کرے جن کا تجھے علم نہیں تو ان کی فرمانبرداری
نہ کرنا اور ان کے ساتھ دنیا میں اچھے طریق سے گذارہ
کرنا۔ اور اس کی راہ پر چلنا جو میری طرف رخ کرے

ماں باپ کا بڑا حق ہے مگر آجکل کے لڑکے اور لڑکیاں
ایسے خراب ہو گئے ہیں کہ شادی ہوتے ہی ماں باپ سے اس
طرح قطع تعلق کر لیتے ہیں جیسے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی اللہ
انہیں ہدایت دے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالٰے عنہ کا
بیان ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے حسن سلوک
کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ نے فرمایا تیری والدہ! سائل
نے دریافت کیا اس کے بعد کون؟ فرمایا تمہاری والدہ! تیسری بار
پھر وہی سوال کیا آپ نے پھر وہی جواب دیا، چوتھی بار سوال کیا
پھر کون؟ اس کے جواب میں فرمایا تمہارا باپ! (بخاری ومسلم)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت میں داخل ہوا تو
اس میں ایک شخص کی قراءت سنی میں نے دریافت کیا کون ہے؟
جواب میں بتایا گیا یہ حارثہ نامی صحابی ہیں (یہ صحابی اپنی والدہ سے
بہت ہی زیادہ حسن سلوک سے پیش آتے تھے) آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کَذٰلِکُمُ الْبِرُّ کَذٰلِکُمُ الْبِرُّ یعنی
تم لوگ اسی طرح (والدین اور دوسرے رشتہ داروں سے حسن سلوک
کیا کرو، دو بار فرمایا (شعب الایمان)

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ

صرف علمی فقہی سوالات ارسال کریں اور جواب کے لئے لفافہ بھیجیں تاکہ البلاغ میں جگہ نہ ہونے یا نمبر دیر میں آنے کے پیش نظر ڈاک سے جواب جا سکے، بعض حضرات وہ سوالات بھی ارسال کر دیتے ہیں جن کے جوابات البلاغ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے جوابات دوبارہ شائع نہ ہوں گے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر بات کا جواب شائع ہی ہو، مدیر کی رائے پر موقوف ہے۔ (م - ع - ا)

سوالات از سید احمد شاہ منی خیل

(۱) حقہ سگریٹ اور نسوار کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

(۲) اخباروں میں جو معمے نکالے جاتے ہیں تو اس کا انعام لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) ماہ رمضان کی تیئسویں (۲۳) رات کو سورۂ عنکبوت اور سورۂ روم پڑھنا جائز ہے؟

(۴) اگر برسات زیادہ ہو جائے اور لوگ تنگ ہو جائیں تو اس حالت میں مسجد کے اندر اذان کہنا تاکہ بارش رک جائے اس لئے یہ عمل درست ہے یا نہیں؟

(۵) بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کا فرق بتائیں اور سمجھائیں کہ کونسی بدعت سیئہ ہے۔ (سید احمد شاہ منی خیل)

(۱) اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

(۲) یہ انعام لینا جائز نہیں، قمار کی ایک صورت ہے۔

(۳) قرآن مجید کی جو سورت جب چاہے پڑھو مگر اپنی طرف سے کسی سورت کے پڑھنے کا کوئی خاص وقت یا دن بغیر ثبوت شرعی کے یہ سمجھ کر مقرر کرنا کہ اس میں دوسرے وقت پڑھنے سے زیادہ ثواب ہوگا درست نہیں ہے، سورہ عنکبوت اور سورۂ روم کو رمضان کی ۲۳ ویں شب میں پڑھنے کی کوئی فضیلت احادیث میں نہیں ملتی۔

(۴) بارش زیادہ ہونے لگے تو یہ دعا پڑھیں اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا، یہ دعا اس موقعہ کے لئے حدیث سے ثابت ہے مسلم شریف ص۲۹۳ ج ۱

(۵) کوئی بدعت حسنہ نہیں حدیث شریف میں ہے کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔

علمائے دین سے سنا ہے کہ گھروں اور مسجدوں میں تصویر یں رکھنا ناجائز ہے، اگر یہ صحیح ہے تو پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ماننے والے اپنے گھروں میں "ٹیلیو یژن" کیوں رکھتے ہیں؟

طالب علم جماعت نہم، ملت بوائز سکنڈری سکول
کورنگی۔ کراچی

مسئلہ تو وہی ہے جو علماء سے سنا ہے کہ جاندار کی تصویریں بنانا گھر میں لٹکانا حرام ہے اور ان سے دلچسپی لینے کی کوئی وجہ جواز نہیں مگر عمل کرانا تو علماء کے بس میں نہیں، ٹیلیویژن مجموعہ منکرات ہے اس سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔

بندوق کا شکار

اگر کوئی شخص بسم اللہ پڑھ کر پرندہ کو بندوق سے گولی مارے اور وہ پرندہ مرجائے تو حلال ہے یا نہیں؟

عبدالرحمٰن گندرو سونڈا (سندھ)

یہ پرندہ حلال نہیں، بندوق کا شکار کردہ جانور اسی وقت حلال ہے جبکہ اسے زندہ پائے اور شرعی طریقہ پر ذبح کرے۔

لاؤڈ اسپیکر پر اذان

آج کل مساجد میں لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے اور مسجد میں اندر کھڑے ہوکر اذان دیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے۔

عبدالحلیم بوری والا ضلع ملتان

مسجد میں اذان دینا مکروہ ہے اگرچہ لاؤڈ اسپیکر پر دی جارہی ہو اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ محراب سے باہر اذان دینے کی جگہ بنالیں اور مائک باہر رکھ کر وہیں کھڑے ہوکر اذان دیدیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ایک خاتون کے چند سوالات

(۱) میرے شوہر بینک میں ملازم ہیں اس کی آمدنی سے بچنے کی کیا صورت کروں، میرے شوہر کا کہنا ہے کہ میں تو محنت کا پیسہ لیتا ہوں اس آمدنی کو پاک بنانے کے لئے کیا تجویز کیجائے اور اگر ایسے لوگوں کے ہاں جن کے ہاں انشورنس یا بینک کی آمدنی آتی ہے دعوت ہو یا کھانا پڑے تو کیا کروں جبکہ وہ رشتہ دار ہوں۔

(۲) میرے بھائی کا کہنا ہے کہ عورتوں کیلئے تبلیغ نہیں ہے یہ مردوں کا کام ہے میرا تبلیغی جماعت سے تعلق ہے، اپنے گھر اجتماع ہوتا ہے میں بھی جاتی ہوں، آپ بتائیں کہ اس طرح گھر سے نکلنا ناجائز ہے؟

ش۔م کراچی

(۱) آپ شوہر کے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ حلال کی طرف ان کا دل پھیر دے اور ان کو مناسب طریقہ پر متوجہ بھی کرتی رہیں، ان کا یہ کہنا کہ محنت کا پیسہ لیتا ہوں جائز ہونے کی دلیل نہیں، شرعاً ہر محنت کا پیسہ جائز نہیں ہوتا ناجائز محنت کا پیسہ بھی ناجائز ہوتا ہے۔ چور، ڈاکو بھی تو محنت کرتے ہیں اور شراب کی بھٹی لگانے والا بھی محنت کرتا ہے پھر بھی آمدنی حرام ہے حرام آمدنی کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں جبتک دوسرا حلال ذریعہ نہ نکلے گناہ سمجھ کر ڈرتے ڈرتے تھوڑا بہت کام میں لاتے رہیں، حرام آمدنی والوں کے یہاں کھانے سے پرہیز لازم ہے خواہ رشتہ دار ہوں مگر تدبیر سے بچیں اور ان کو راہ پر لانے کی بھی سعی کریں۔

(۲) تبلیغی جماعت کے زنانہ تبلیغی اجتماعات میں عورتوں کو شرکت کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے مگر ان ہی شرطوں کے ساتھ جو شرطیں جماعت کے ذمہ دار شریعت کے مطابق بتاتے ہیں، عورتوں میں یا تو دینی جذبہ ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو ضرورت سے زیادہ نیک بن جاتی ہیں، باہر نکلنے کے لئے پردہ کا خاص اہتمام کرنا اور محرم کو ساتھ لینے کی فکر کرنا بعض مرتبہ رہ جاتا ہے، نیز شوہر کی اجازت کے بغیر بھی چلدیتی ہیں حقوق کی رعایت کے ساتھ شرعی حدود میں کام کرنا درست ہے۔

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے ارسال فرمایئے)

اسلامی تعلیمات

مؤلفہ مولانا قاضی عبدالحی چمن پیر صاحب، شائع کردہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور، کتابت و طباعت معیاری عکسی، تقطیع ۲۲×۲۰/۱۶، صفحات ۴۴۳، قیمت چار روپے۔

عرصہ سے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ اسلام کے بنیادی عقائد و احکام کو سمجھانے کے لئے ایک مختصر کتاب لکھی جائے، جس کی مدد سے اسلام کی بنیادی تعلیمات کا علم حاصل کیا جا سکے۔ یہ کتاب اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے، اور اس میں عقائد سے لے کر عبادات، معاملات، معاشرت، سیاست اور آداب و حقوق تک کے تمام شعبوں سے متعلق وہ ضروری معلومات جمع کر دی ہیں جن سے کسی بھی مسلمان کو بے خبر نہ ہونا چاہئے، فاضل مؤلف نے جس عمدہ ترتیب، اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے، اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، اس کتاب پر پیش لفظ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"رئیس الجامعہ جامعہ اسلامیہ نے اپنی سرپرستی میں مولانا چمن پیر صاحب سے زیر نظر کتاب بنام "عقائد و مسائل" مرتب کروائی جو صحت معنا بین، حسن ترتیب سہولت بیان کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات کی جامع (رہنما)

جس حد تک تبصرہ نگار نے کتاب کو دیکھا، اس میں بیان کردہ عقائد و مسائل متفق علیہ اور معتبر و مستند ہیں۔ البتہ دو ایک مقامات پر مرجوح اور غیر مفتیٰ بہ اقوال بھی آ گئے ہیں، مثلاً:

"اگر کوئی بے جوڑ (غیر کفو میں) شادی ولی کی رضامندی کے بغیر منعقد ہو گئی تو ولی کو حق حاصل ہے کہ شرعی قاضی (عدالت) سے درخواست کر کے اس نکاح کو فسخ کرا لے (ص ۱۳۰، ۱۳۹)

فقہاء حنفیہ کی تصریح کے مطابق اس قول پر فتویٰ نہیں ہے، فتویٰ اس پر ہے کہ ولی کی رضامندی کے بغیر لڑکی غیر کفو میں نکاح کرے تو وہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتا۔ علامہ شامی لکھتے ہیں

"لو تزوجت غیر کفو فالمختار للفتوی روایۃ الحسن انہ لا یصح العقد" (رد المحتار ص ۴۴۴ ج ۲)

نیز مؤلف نے مصارف زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"ہر ایسا آدمی ... جس کی آمدنی خرچ کو پورا نہیں کر سکتی (ص ۹۵)

یہ الفاظ بہت مجمل ہیں، اور ان سے مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے یوں لکھنا چاہئے کہ:

"وہ شخص جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار کا بالکل مالک نہ ہو۔ یا مالک ہو تو یہ رقم اس کی اصلی ضروریات خورد و نوش و رہائش سے بچتی نہ ہو۔"

کتاب کا انداز بیان مجموعی طور سے عام فہم ہی ہے لیکن کچھ اور آسان ہوتا تو اچھا تھا، تاکہ عوام اس سے پوری طرح مستفید ہو سکتے ——— بہرصورت کتاب مجموعی حیثیت سے نہایت مفید اور قابل مبارکباد ہے، اور اس لائق ہے کہ اسے سیکنڈری اسکولوں میں اسلامیات کے تحت داخل نصاب کیا جائے۔

(م ۔ ت ۔ ع)

فضائل مدینہ

مرتبہ مولوی عابد الرحمٰن صاحب
ناشر مکتبۂ اصلاح وتبلیغ حیدرآباد،

جامع مسجد روڈ حیدرآباد (پاک) کتابت وطباعت متوسط۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۹۲، قیمت دو روپیہ پچاس پیسے

یہ کتاب مولانا مفتی اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی رح کے صاحبزادۂ گرامی نے مرتب کی ہے، اور اس میں مدینہ طیبہ کے فضائل اور خواص روایات حدیث سے جمع کردیئے ہیں جن سے اس "مرکز ایمان" کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے، ساری کتاب روایات حدیث سے بھری ہوئی ہے، جو غالباً علامہ سمہودیؒ کی وفاء الوفاء سے ماخوذ ہیں۔ فاضل مؤلف اگر روایات کے حوالے بھی دیدیتے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ——— بہرکیف! مجموعی طور پر کتاب مفید اور لائق مطالعہ ہے، اور اگر اگلی اشاعت میں مدینہ طیبہ کے خاص خاص تاریخی مقامات کا تعارف بھی وفاء الوفاء کی روشنی میں مرتب کردیا جائے تو بڑا اچھا ہو۔　　(م ۔ ت ۔ ع)

خلائی تسخیر اور قرآن کریم

مؤلفہ جناب ابو مسعود نقشبندی
شائع کردہ ادارہ فروغ اسلام

شجاع آباد پاکستان۔ کتابت وطباعت متوسط، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۴۰۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن چار روپے، سستا ایڈیشن تین روپے۔

مذہب اور سائنس میں حقیقتاً کوئی ٹکراؤ نہیں، اتفاق سے سائنس کی نشأۃ ثانیہ کے وقت سائنس کو جس مذہب سے سابقہ پڑا وہ عیسائیت تھا جس نے صدیوں سے علم وعقل کو در [illegible] اپنے اوپر بند کئے ہوئے تھے، چنانچہ سائنسدانوں کو عیسائی مذہب کے خلاف جو جنگ لڑنی پڑی اس نے انہیں مطلق مذہب ہی سے بیزار کردیا، اور خواہ مخواہ سائنس کو مذہب کا مدمقابل سمجھ لیا گیا، اس کتاب میں اسی حقیقت کو مدلل طور سے واضح کیا گیا ہے کہ سائنس کو اگر اس کے صحیح مقام پر رکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسلام اس کی کوئی مخالفت نہیں کرتا بلکہ اس راہ کی کوششوں کو مستحسن سمجھتا ہے فاضل مصنف نے اس موضوع پر قرآن کریم کی آیات اور مفسرین کے اقوال سے استدلال کرکے ثابت کیا ہے کہ سائنس کے نت نئے انکشافات کس طرح اسلامی تعلیمات کی خوبیوں کو مزید واضح کر رہے ہیں۔

مصنف کی فکر نہایت معتدل اور متوازن ہے اور انھوں نے ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھا ہے، انھوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:

> "سائنس کا کوئی بھی تحقیق شدہ مسئلہ اسلام کی مقدس تعلیم کے خلاف نہیں، اسی طرح مجھے اس حقیقت کو بیان کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ سائنس کے ہر مفروضہ کو من وعن قبول کرنا ذہن انسانی پر مبالغہ کی حد تک مسلط کردینے کے مترادف ہے...... خدا کے فضل وکرم سے ہم کبھی شکست خوردگی کا شکار نہیں ہوئے اس لئے ہم صرف متزلزل مفروضات کی بنا پر اہل نیچر کی طرح مذہب کے کسی بھی اصول کی من مانی تاویل کرنے کے قائل نہیں" (ص ۶۵)

مصنف نے ثابت کیا ہے کہ سائنس کے تمام مبنی بر تحقیق انکشافات مندرجہ ذیل قرآنی پیشین گوئی کے تحت آتے ہیں کہ:

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق (حٰمٓ السجدہ)

> ہم ان کو اپنے نشانات آفاق میں بھی اور ان کے نفسوں میں بھی ضرور دکھاتے رہیں گے، حتیٰ کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے

یہ کتاب مجموعی طور پر دلچسپ اور مفید ہے، اور اس نے ایک ایسے موضوع پر اعتدال کی راہ پیش کی ہے جس میں عام طور سے لوگ افراط اور تفریط کا شکار رہتے ہیں۔　　(م ۔ ت ۔ ع)